بچوں کا پسندیدہ رسالہ

ماہنامہ

ساتھی

کراچی

ستمبر ۲۰۱۵ء

ستمبر کے مہینے میں ستم گر یاد آتے ہیں
سبھی قصّے شجاعت کے برابر یاد آتے ہیں

میں اِک چھوٹا سا بچّہ ہوں میری امّی بتاتی ہیں
شہیدوں، غازیوں کی داستانیں وہ سُناتی ہیں

ضیاء اللہ محسن

نسلِ نو کا منفرد ادبی ترجمان

ماہنامہ
ساتھی
کراچی

یک رنگ دلوزبانوں میں شائع ہونے والا واحد ماہنامہ

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۹

ستمبر ۲۰۱۵ء

قیمت ۳۰ روپے

مدیر
فصیح اللہ حسینی

مجلسِ ادارت
محمد طارق خان
عبدالصمد بھٹی
عبدالرحمٰن المومن
0334-3024835

شعبہ مارکیٹنگ
سید طلال علی
0333-2381277
اسامہ شیخ
0336-2246181

شعبہ آئی ٹی
محمد یوسف منیر

سالانہ خریداری
رجسٹرڈ ڈاک 500 روپے
مشرقِ وسطیٰ 75 ریال
دیگر ممالک 35 ڈالر

ناشر: سرفراز احمد

رابطہ کیجیے

ایف 206، سلیم ایونیو بلاک 13-B
گلشنِ اقبال، کراچی
پوسٹ بکس نمبر: 17982
فون نمبر: 34976468
اوقاتِ کار: شام ۵ تا رات ۱۰ بجے

monthlysathee@hotmail.com
satheecirculation@gmail.com
www.facebook.com/monthlysathee

خودی بلند تھی اس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بہت دل کشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکی شمشیر

کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ کسی چینی باشندے پر قتل کا جُرم ثابت ہوا اور جب وہ اس کی سزا پانے لگا تو اس نے جلاد سے کہا: ''ذرا ٹھہر جاؤ، میرے موبائل کا کیمرا بہت بلند پایہ ہے۔ اس شمشیر کے ساتھ جس سے مجھے قتل کیا جائے گا، میں ایک ''سیلفی'' لینا چاہتا ہوں''۔ اگر آج کی بات ہوتی تو شاید ایسا ہی ہوتا۔ آج کے نوجوان نے خودی کا مطلب ''سیلفی'' سمجھ لیا ہے۔

علامہ اقبال اس مصرعے میں یہ بتا رہے ہیں کہ ایک چینی باشندے کو قتل کی سزا ملنے والی تھی۔ جب سزا کا وقت ہوا تو اس نے جلاد سے کہا: ''ذرا ٹھہر جا! مجھے یہ نظارہ بہت پیارا لگ رہا ہے۔ ذرا تیری تلوار کی چمک دَمک دیکھ لوں''۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس ہمت اور بے خوفی سے اس چینی باشندے کی خودی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اللہ ہمیں بھی اقبال کے تصورِ خودی سے آشنا کردے (آمین)

ساتھی چٹخارے

میاں بلاقی اور پالتو جانور
جاوید بسام
۹

۱۶	روشنی	منیب عبدالرحمٰن صدیقی
۲۲	بابائے کیمیا	ادارہ
۲۸	بادلوں کا سفر	اظہر عباس

بلی اور شامہ کا قصہ (نظم)
احمد حاطب صدیقی
۲۴

۳۳	ذرا کھلکھلائیے	قارئین
۳۶	آئیڈیا ہمارا، کہانی آپ کی	علینہ کنول
۳۹	حاتم طائی کا بیٹا	عظمیٰ ابونصر صدیقی

پھول ہی پھول
۴۱

۴۳	سلیمیہ مسجد	ادارہ
۴۴	جہیز کی بطخ	بینا صدیقی
۵۲	ڈھن لڑاؤ۔انعام پاؤ	

ایک جھوٹی کہانی
وقار محسن
۴۹

۵۷	کارنامہ	زبیر فرید
۶۱	حیوانی حقیقتیں	ظفر شمیم
۶۲	ستمبر کے مہینے میں (نظم)	ضیاء اللہ محسن

حیرت انگیز دعوت
ترجمہ: گل رعنا
۶۹

۶۴	قطب شمالی کے سرد سمندر میں	قاضی طارق
۶۸	کوشش جاری رکھیں	ادارہ
۷۳	یارب تیرے در پر آئے	نعیم الدین نعیم

میری ننھی گڑیا
ابن آس
۷۷

۷۴	اُردو زبان ہماری	اطہر علی ہاشمی
۸۳	شعر بھری	
۸۸	ایک تھا ٹھو (نظم)	شمیم فاطمہ

لال بیک ایڈونچر
معروف احمد چشتی
۸۴

۸۹	جادو کے دستانے	احمد عدنان طارق
۹۵	ایک خط جنگ کے میدان میں	الطاف حسین
۱۰۶	خط۔رے	

آپ کی تخلیق
۹۹

۹۹	ہزاروں خواہشیں ایسی	ثمن عمران
۱۰۱	مصعب میاں کا دانت	ردا فاطمہ
۱۰۳	ٹریفک نامہ	بلال سہیل

علیکم السلام

فیصل آباد کے رہنے والے بچوں کے پسندیدہ قلم کار انسپکٹر عدنان طارق کا فون آیا۔ عید کی مبارک باد دینے کے بعد کہنے لگے: ''تین لوگوں کا رابطہ نمبر چاہیے، جنھیں میں نے پڑھا بھی..... اُن سے سیکھا بھی..... اور جب میں نے شروع شروع میں لکھا تھا اُس وقت یہ صاحبان بھی مختلف رسائل میں لکھا کرتے تھے۔ میں اُن سے بات کرنے کا خواہش مند ہوں۔''

اُن تین لوگوں میں ایک 'وقار محسن' صاحب تھے۔ لیکن.....!

تھوڑی دیر بعد عدنان طارق صاحب کا دوبارہ فون آیا..... اور یہ فون ایک بُری خبر لیکر آیا تھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ ''وقار محسن'' صاحب انتقال کر چکے ہیں۔ ایک لمبے موبائل فون کو تکتے رہے کہ یہ اچانک کیسی خبر سُننے کو ملی۔ لیکن خبر سچ تھی۔

اس خبر کی تصدیق کروانے کے بعد ایک تعزیتی خبر چلائی گئی۔ مُلک بھر سے قلم کاروں نے اُن کی موت پر گہرے دکھ درد کا اظہار کیا۔ ہر کوئی تفصیلات جاننا چاہ رہا تھا۔ انتقال سے چند دن قبل ہی اُنھوں نے دو کہانیاں ساتھی کو ای میل کی تھیں۔ جن میں سے ایک کہانی اس ماہ آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

۷۱ سال کی عُمر میں داعی اجل کو لبیک کہنے والے وقار محسن نے پسماندگان میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی چھوڑے۔ وہ اکثر اپنی تحریروں میں اپنے پوتوں اور نواسوں کا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اُن کی بچوں کے لیے کی گئی کاوشوں کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت بخشے اور اُنھیں جنت الفردوس میں اعلا مقام عطا فرمائے۔ آمین

والسلام

آپ کا ساتھی

فصیح اللہ حسینی

میاں بلاقی اور پالتو جانور

جاوید بسام

بلاقی نے اپنے دوست کی مدد تو کر دی لیکن یہ مدد اُسے منہگی پڑ گئی

یہ ان دنوں کی بات ہے، جب لوگ بگھیوں اور گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ امریکا کے ایک دور دراز قصبے میں بلاقی نام کا ایک کوچوان اپنی دو گھوڑوں والی بگھی میں سامان لے جانے کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ ایک محنتی اور ایمان دار آدمی تھا۔

ایک دن وہ کسی کام سے کچہری آیا ہوا تھا۔ کیاریوں کے پاس سے گزرتے ہوئے کسی نے اوپر سے اُسے پکارا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا تو اس کے پرانے پڑوسی جج ہنری کھڑکی سے گردن نکالے جھانک رہے تھے، اُنھوں نے اپنی مخصوص ججوں والی ٹوپی اُتاری ہوئی تھی، جس سے ان کے بڑے بال چہرے پر آ گئے تھے۔

وہ زور سے بولے: ''میاں بلاقی! اچھا ہوا تم مل گئے، مجھے تم سے ایک ضروری کام ہے۔ کل دوپہر ایک بجے کی گاڑی سے میرا ایک پالتو جانور آ رہا ہے، اسے اسٹیشن سے لے کر میرے گھر پہنچا دینا۔ یہ لو رسید اسے

کھونا نہیں، یہ تمھیں وہاں دکھانی پڑے گی۔"

اُنھوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ نیچے چھوڑ دیا۔ وہ ہوا میں اُڑتا آہستہ آہستہ نیچے آیا۔ بلاقی نے جھک کر کاغذ اٹھایا اور بولا: "وہ پالتو جانور کون سا ہے؟" لیکن جج ہنری کھڑکی سے ہٹ چکے تھے۔ بلاقی نے رسید پر نظر دوڑائی لیکن اس سے بھی پتا نہ چلا۔ "خیر کوئی بھی جانور ہو مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ بڑبڑایا اور باہر کی طرف چل دیا۔

دوسرے دن وہ ایک گھنٹے قبل ہی اسٹیشن جا پہنچا۔ اسے اسٹیشن کا کھلا ماحول اچھا لگتا تھا۔ وہ بنچ پر آرام سے ٹانگیں پسار کر بیٹھ گیا۔ وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے، کچھ گاڑی کے انتظار میں ٹہل رہے تھے اور کچھ سفر سے واپس آ کر اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ایک بجے، تو وہ گاڑی آ گئی جس کا بلاقی کو انتظار تھا۔ وہ اُٹھ کر جانوروں کے لیے مخصوص ڈبے کی طرف بڑھ گیا۔ جب اس نے ڈبے کے نگراں کو رسید دکھائی تو اس نے منھ بنا کر بلاقی کو دیکھا اور اندر چلا گیا۔ بلاقی تجسس سے باہر کھڑا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بھورے رنگ کے کتے کی زنجیر پکڑے نمودار ہوا۔ بلاقی کو دیکھ کر کتا زور سے بھونکا۔ بلاقی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کتا بہت بڑا تھا۔ اس کی لمبی ٹانگیں، بھاری جسم اور چوڑی کالی تھوتھنی تھی۔ بلاقی نے اتنا بڑا کتا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نگراں بولا:

"سنبھالو اِسے! اس شریر نے سارے راستے ہمیں بہت تنگ کیا ہے اور یہاں دستخط کر دو۔"

بلاقی نے دستخط کیے اور ڈرتے ڈرتے کتے کی زنجیر تھام لی۔ کتے کا قد اس کے پیٹ تک پہنچ رہا تھا۔ جونہی بلاقی اسے لے کر آگے بڑھا۔ کتے نے تیزی دکھائی اور اس سے آگے نکل گیا۔ وہ بلاقی کو کھینچتے ہوئے تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ اس کا رخ کبھی کسی طرف ہو جاتا۔ کبھی کسی طرف۔ بلاقی کو اسے سنبھالنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جج صاحب نے یہ کیسا کتا منگوالیا ہے۔

اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے اس کی ملاقات اپنے ایک پرانے دوست سے ہوگئی، جو ریلوے کا ملازم تھا۔ وہ حیرت سے بولا: "بلاقی! یہ اتنا خوفناک کتا تمھارا ہے؟"

"نہیں نہیں، توبہ کرو، میں تو کبھی ایسا جانور نہ پالوں یہ تو جج ہنری کا ہے۔" بلاقی بولا۔

دوست نے اسے چائے کی دعوت دی۔ بلاقی نے انکار کر دیا اور بولا: "یہ کتا بہت بے چین ہے مجھے لگتا ہے اسے تمھارا اسٹیشن پسند نہیں آیا، چائے اُدھار رہی، پھر کبھی پیوں گا۔" دوست ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔

بلاقی نے باہر آ کر کتے کو گاڑی پر لادا۔ وہ بہت مشکل سے گاڑی پر چڑھا۔ گھوڑے اُسے دیکھ کر بدکنے لگے تھے۔ بلاقی نے سانس درست کرتے ہوئے گھوڑوں

کو چابک مارے اور چل دیا۔ جج ہنری کا گھر کچہری کے پچھلی طرف تھا۔ بلاقی پہلے بھی وہاں جا چکا تھا۔ سارے راستے کتا بھونکتا رہا تھا۔

کچھ دیر میں وہ وہاں جا پہنچے۔ بلاقی نے بگھی روکی اور احاطے کو عبور کر کے عمارت کے دروازے پر پہنچا لیکن یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ دروازے پر ایک بڑا سا تالا لگا ہے۔ اس نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کھڑکیاں، روشن دان بند پڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا گھر میں کوئی نہیں ہے، اچانک اس کی نظر دروازے پر لگے ایک پرچے پر پڑی جس پر جلی حروف میں 'بلاقی کے لیے' لکھا تھا۔ اس نے پرچہ اُکھاڑ لیا اور کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

"میاں بلاقی! میں معذرت خواہ ہوں جب تم یہاں پہنچو گے تو گھر کو بند پاؤ گے دراصل ابھی ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ دوسرے شہر میں میرا بھائی سخت بیمار ہے۔ میں وہاں جانے کے لیے نکل رہا ہوں۔ ملازم کو میں گھر پر چھوڑ رہا تھا لیکن اسے بھی اپنے کچھ کام یاد آ گئے ہیں، بے چارے نے ایک سال سے کوئی چھٹی نہیں کی۔ تمھیں زحمت تو ہوگی لیکن مجھے یقین ہے تم میرے کتے کو کچھ دن کے لیے اپنے پاس رکھ لو گے۔"

فقط: تمھارا دوست، جج ہنری.....

بلاقی کے منھ سے بے اختیار آہ نکلی اور وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ آخر اسے کتے سمیت واپس لوٹنا پڑا۔ جب وہ اپنے گھر کے باہر اسے اُتار رہا تھا تو اس کی پڑوسن وہاں سے گزر رہی تھیں، انھیں بھولنے کی عادت تھی وہ بولیں: "میاں باقی! تم یہ اتنا بڑا گدھا کہاں سے لے آئے ہو؟"

بلاقی نے منھ بنایا اور بولا: "میرا نام بلاقی ہے اور یہ گدھا نہیں بلکہ کتا ہے۔"

وہ کتے کو دیکھتے ہوئے بولیں: "ایک ہی بات ہے" اور آگے بڑھ گئیں۔ بلاقی، کتے کو گھر کے احاطے میں لے آیا اور اسے ایک درخت سے باندھ دیا۔ کتا بھوکا لگ رہا تھا۔ بلاقی ابھی سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کھلائے کہ باہر سے مچھلی بیچنے والے کی آواز سنائی دی۔ وہ باہر نکلا اور کچھ مچھلیاں خرید کر کتے کے آگے ڈالیں۔ کتا انھیں کھانے لگا۔ بلاقی دوبارہ اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔ کتے کے بھونکنے کی خوفناک آواز اسے دور تک سنائی دیتی رہی تھی۔

شام کو جب وہ واپس آیا تو گھر کے باہر بہت سے پڑوسی جمع تھے۔ وہ جلدی سے ان کی طرف بڑھا۔ وہ لوگ، کتے کے دھماچوکڑی مچانے پر وہاں آئے تھے۔ سب تیزی سے بولنے لگے: "بلاقی! یہ تم کیا چیز لے آئے ہو؟"

"بلاقی! اس نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔"

بلاقی نے احاطے میں جھانکا۔ کتے نے زنجیر توڑ لی تھی اور سارے احاطے میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ ساتھ ہی

خوفناک آوازیں نکال رہا تھا۔ بلاقی نے کچھ دن پہلے احاطے میں پھول پودے لگوائے تھے۔ کتے نے تمام کیاریاں اُجاڑ ڈالی تھیں۔ چینی کی وہ سفید طشتیں جنہیں وہ بڑے شوق سے خرید کر لایا تھا، مٹی میں ٹوٹی پڑی تھیں۔ اس نے پڑوسیوں سے معذرت کی اور احاطے میں داخل ہوگیا۔ کتا اُسے دیکھ کر چپ ہوگیا اور محبت سے دم ہلانے لگا۔ بلاقی کے پڑوس میں ایک پولیس والا رہتا تھا۔ وہ غصے سے بولا ”بلاقی اگر تم نے یہ کتا اسی وقت یہاں سے دفع نہ کیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“

بلاقی بولا: ”ضرور گولی مارو یہ جج ہنری کا ہے اُنھوں نے چند دنوں کے لیے میرے پاس رکھوایا ہے۔“ جج کا نام سن کر وہ خاموش ہوگیا۔ پھر لوگ آہستہ آہستہ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

بلاقی بھی اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔ لیکن جیسے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا، کتے نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔ بلاقی کو باہر آنا پڑا، پھر یہی ہوتا رہا۔ بلاقی جونہی گھر میں جاتا، کتا بھونکنے لگتا آخر وہ کرسی ڈال کر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اسے اپنے پڑوسیوں کی تکلیف کا احساس تھا اس لیے ساری رات اسے وہاں گزارنی پڑی۔

دوسرے دن وہ کتے کو گوشت مارکیٹ لے گیا۔ وہاں بہت رش تھا۔ لوگ حیرت سے اتنے بڑے کتے کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک بلی دوڑتی ہوئی آگے سے گزری۔ کتے نے جھٹکے سے زنجیر چھڑائی اور بلی کے پیچھے بھاگا۔ بلاقی بوکھلا کر اس پر چیخا۔ کتے کے بھاگنے سے مارکیٹ میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ ڈر کر اس سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بہت سے لوگ پھسل گئے۔ قصابوں نے غصے میں آکر چلانا شروع کر دیا۔ کتا بھی زور زور سے بھونک رہا تھا۔ بلاقی نے بہت مشکل سے اُسے قابو کیا۔ وہ بہت شرمندہ تھا اور لوگوں سے بار بار معذرت کر رہا تھا۔

کتے کو سنبھال کر وہ ایک قصاب کے پاس رک گیا اور اس سے چھیچھڑے خریدے، جنھیں کتا وہیں کھڑے کھڑے چٹ کر گیا۔ اس کی بھوک کو دیکھتے ہوئے بلاقی کو اور لینے پڑے۔ وہ بھی کتا فوراً کھا گیا۔ بلاقی کی جیب خالی ہوگئی لیکن کتے کا پیٹ نہ بھرا، وہ اِدھر اُدھر منھ مار رہا تھا۔ آخر بلاقی اسے واپس لے آیا۔ اس دن وہ کام پر بھی نہیں جا سکا تھا۔

اسی طرح تین دن گزر گئے۔ وہ روز جج ہنری کے مکان پر جاتا، لیکن جج صاحب کا کہیں پتا نہ تھا۔ بلاقی کے پاس پیسے ختم ہو رہے تھے۔ کتے کی خوراک اسے اپنے کھانے سے بھی مہنگی پڑ رہی تھی۔ چوتھے دن اسے ایک گھر کا سامان کہیں پہنچانا تھا۔ اس نے سوچا کتے کو کانجی ہاؤس میں چھوڑ آتا ہوں۔ کانجی ہاؤس قصبے سے باہر ایک سنسان جگہ پر تھا۔ بلاقی، کتے کو

لے کر وہاں پہنچا لیکن اس کی حالت دیکھ کر اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہاں بہت گندگی تھی۔ دو لنگڑے گدھے، ایک خارش زدہ اونٹ اور چند بندر پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ ان کا نگراں بہت بوڑھا شخص تھا اور اسے اپنے کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلاقی واپس آ گیا۔ پھر اس کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنی گاڑی میں آگے کی طرف ایک تختہ لگا کر جگہ (پارٹیشن) بنائی اور کتے کو اس کے پیچھے باندھ دیا۔ کتے کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ وہ آرام سے وہاں سو گیا۔

بلاقی اپنے کام پر پہنچا اس نے گاڑی میں سامان بھرا اور روانہ ہوگیا۔ جب وہ دوسرے مکان پر سامان اُتار رہا تھا تو چند اُچکوں نے اسے تاڑ لیا۔ وہ سامان کے ڈبے اٹھا کر اوپری منزل میں پہنچا رہا تھا۔ جس وقت وہ اندر جاتا تو گاڑی کے پاس کوئی نہیں ہوتا تھا۔ وہاں سناٹا بھی تھا۔ ایک دفعہ بلاقی اندر گیا تو وہ تیزی سے گاڑی پر چڑھ گئے۔ ابھی وہ ڈبے کھول کر جائزہ لے رہے تھے کہ کتے کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور اپنی زوردار آواز میں بھونکنے لگا۔ اُچکے ڈر گئے اور سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ بلاقی فوراً نیچے آیا۔ کتے کے بروقت بھونکنے سے اُچکے کچھ بھی نہیں چرا سکے تھے۔

بلاقی نے اسے چمکارا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

غرض اسی طرح کام کرتے دس روز گزر گئے۔ کتا، بلاقی کے ساتھ روزانہ کام پر جاتا تھا۔ لوگ اُسے دیکھنے کے لیے رک جاتے تھے۔ پورے قصبے میں وہ ”بلاقی کے کتے“ کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ پھر ایک دن پتا چلا کہ جج صاحب واپس آگئے ہیں۔ بلاقی فوراً وہاں پہنچا۔ کتے کو دیکھتے ہی جج ہنری حیرت سے چلا اُٹھے: ”بلاقی! یہ تم کیا پکڑ لائے ہو۔ میں نے صحت مند کتا منگوایا تھا، کتوں کے تاجر نے یہ کیا بھیج دیا؟ بلاقی نے انھیں پورے دس دنوں کی روداد سنائی، جج صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولے: ”میں تو اسے ایک دن بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا، کیا میں اسے اپنے ساتھ کچہری لے کر جاؤں گا۔ نا بابا نا! اسے واپس بھیجو۔“

وہ اپنے ملازم کو آوازیں دینے لگے۔ ملازم آیا تو وہ بلاقی سے بولے: ”میاں بلاقی! تم اسے واپس گاڑی میں سوار کر دو۔ میں تمھارا سارا نقصان پورا کروں گا۔ میں اس تاجر کو خط لکھ رہا ہوں، مجھے کوئی چھوٹا کتا چاہیے۔“

بلاقی اور ملازم، کتے کو لے کر اسٹیشن روانہ ہوگئے۔ اسٹیشن پہنچ کر اُنھوں نے کتے کے لیے ٹکٹ خریدا اور اسے جانوروں کے ڈبے کی طرف لے گئے۔ جب اُنھوں نے اسے ڈبے میں چڑھانا چاہا تو وہ واپس پلٹ آیا۔ اُنھوں نے کئی بار کوشش کی لیکن وہ بار بار پلٹ آتا اور بلاقی کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتا، جیسے جانا نہ چاہتا ہو۔ وہ مسلسل بھونک رہا تھا۔ بلاقی کو اس

کی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔ دس دن ساتھ رہ کر کتا اس سے بہت گھل مل گیا تھا۔ بلاتی کو بھی اُنس ہو گیا تھا، لیکن وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ آخر اسے گھسیٹ کر گاڑی میں سوار کرادیا گیا۔ وہ جالی سے باہر جھانکتے ہوئے بے چینی سے اِدھر اُدھر حرکت کررہا تھا اور زور زور سے بھونک رہا تھا۔ گاڑی چلی تو بلاتی دیر تک اسے ہاتھ ہلاتا رہا، پھر گردن جھکائے اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆

عثمان پبلک اسکول میں ''عشرہ اقبال'' کا انعقاد

رپورٹ: ذیشان حیدر

علامہ اقبال وہ عظیم علمی وادبی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی امّتِ مسلمہ کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لیے وقف کردی تھی۔ آپ کی امّتِ مسلمہ کے لیے دی جانے والی انہی بے مثال خدمات اور قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اور آپ کی تعلیمات کے فروغ کے لیے ہر سال کی طرح امسال بھی عثمان پبلک اسکول سسٹم (کیمپس IX) میں ''عشرہ اقبال'' نہایت جوش وخروش کے ساتھ منایا گیا لیکن اس سال ایک نئی اور حوصلہ افزاء بات یہ ہوئی کہ ''عشرہ اقبال'' منانے میں ہمارے ساتھ ''بزمِ ساتھی'' بھی شامل تھی۔ عشرہ اقبال کی ابتداء سے لے کر اختتام تک روزانہ اسمبلی میں کلامِ اقبال پڑھا گیا اور علامہ اقبال کی شاعری اور ان کی شخصیت کے حوالے سے تقاریر کی گئیں۔ مضمون نویسی کے مقابلے میں طلبہ نے دیے گئے موضوع پر فی البدیہہ مضمون لکھا۔ مقابلہ مصوّری میں علامہ اقبال کے اشعار کی منظر کشی کی گئی۔ بیت بازی میں دو جماعتیں بنائی گئیں ایک دبستانِ دلّی اور دوسری دبستانِ لکھنو، دونوں جماعتوں سے پانچ پانچ شرکاء تھے۔ پروگرام کے اختتام پر نمایاں کارکردگی دکھانے والے طلبہ میں انعامات تقسیم کیے گئے۔

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی چند مفید کتابیں

بنگلا دیش کا عدالتی ڈراما	30/=	مسلمان عورت کے حقوق	200/=
حدیثِ نبویؐ اور سائنسی علوم	400/=	مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	40/=
Sayyidnā Muhammad ﷺ The Greatest Benefactor of Mankind	500/=	گھریلو تشدد اور اسلام	60/=
اسلامی تصوف	350/=	اسلام میں بچوں کے حقوق اور تحفظ	70/=
مسلمانانِ جنوبی ایشیا کے سیاسی افکار کی جدید تشکیل	150/=	آزاد بچے، آزاد والدین	250/=
اسلام کا فلسفۂ تاریخ	120/=	بچوں سے گفتگو کیسے کریں؟	160/=
حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	30/=	بچوں میں خوف	120/=
قرآن کا نظامِ خاندان	30/=	برصغیر میں اسلامی صحافت کی تاریخ اور ارتقا	600/=
تجلیاتِ قرآن	450/=	شکستِ آرزو (جب پاکستان دولخت ہوا)	500/=
فہم القرآن کوئز	200/=	سفر آدھی صدی کا	350/=
انسان کی تخلیق	150/=	پاکستان: سیاست اور اسلامی قانون	250/=
خانگی زندگی اور اُسوۂ حسنہ	40/=	پاکستان اور سیکولرازم	90/=
عورت اور اسلام	150/=	جمہوریت اور اسلام۔ مغرب کا مقدمہ	250/=
اسلام کا عائلی نظام	150/=	کراچی کا آتش فشاں	30/=

اور دیگر بیسیوں کتابیں اور کتابچے ــ قاری کے لیے مفید اور کتب خانے کی زینت!

پندرہ روزہ **معارف فیچر**

ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر سے دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور وفکر کے لیے اہم یا مفید (Food for Thought) ہوسکتی ہیں۔ **اپنا رقمی پتا بھیجیے اور ''معارف فیچر'' حاصل کیجیے۔**

ابھی طلب کیجیے! **اکیڈمی بک سینٹر**

ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

کراچی فضلی سنز۔ اردو بازار۔ 32212991 | دارالاشاعت۔ اردو بازار۔ 32213768 | ویلکم بک پورٹ۔ اردو بازار۔ 32633151

لاہور اسلامک پبلی کیشنز۔ منصورہ، ملتان روڈ۔ 37320961 | ادارہ مطبوعاتِ طلبہ۔ A-1، ذیلدار پارک، اچھرہ۔ 37553991

اسلام آباد ملت پبلی کیشنز، فیصل مسجد۔ فون: 051-2254111 | **جہلم** بک کارنر، بک اسٹریٹ۔ فون: 0321-5777931

روشنی

منیب عبدالرحمن صدیقی

قافلے کی تمام عورتوں نے اس بچے کو لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ یتیم تھا

یہ نوشیرواں کی تخت نشینی کا چالیسواں سال تھا۔ پیر کا دن تھا۔ ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگورے گر گئے۔ مجوسیوں کا آتش کدہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسی روز مکہ میں بنی ہاشم سے تعلق رکھنے والے ایک معزز شخص عبدالمطلب کے پوتے کی ولادت ہوئی۔ ولادت کے بعد بچے کی والدہ نے عبدالمطلب کے پاس خوشخبری بھجوائی۔ وہ خوشی خوشی تشریف لائے اور بچے کو لے کر خانہ کعبہ میں گئے، اللہ کا شکر ادا کیا اور بچے کا نام محمد رکھا۔

عرب کے شہری باشندوں کا یہ دستور تھا کہ وہ اپنے بچوں کو شہری امراض سے دور رکھنے کے لیے انھیں گاؤں کی عورتوں کے حوالے کر دیتے تھے تاکہ بچہ صحت مند ماحول میں پرورش حاصل کرے اور شروع

سے ہی خالص اور ٹھوس عربی زبان سیکھ لے۔ چنانچہ آپؐ کے دادا نے آپؐ کے لیے ایک ایسی ہی عورت کی تلاش شروع کر دی۔

اُدھر بنوسعد کی دیہاتی عورتوں نے بھی اسی مقصد کے لیے مکہ کی طرف سفر شروع کر دیا۔ ان عورتوں کے قافلے میں حلیمہؓ نامی ایک عورت بھی شامل تھیں۔ جن کی سواری بہت کمزور اور سست رفتار تھی۔ اسی وجہ سے قافلے والے حلیمہؓ سے بہت آگے نکل گئے اور یہ پیچھے رہ گئیں۔ قافلے کی تمام عورتوں نے آپؐ کو لینے سے انکار کر دیا کیونکہ آپؐ یتیم جو تھے۔ آخر میں جب حلیمہؓ مکہ پہنچیں تو آپؐ کے علاوہ تمام نومولود بچوں کو قافلے کی عورتیں لے جا چکی تھیں۔ لہٰذا حلیمہ کو آپؐ کی پرورش اور دیکھ بھال کا شرف حاصل ہوا۔

بنوسعد کے اسی گاؤں میں آپؐ پلے بڑھے۔ جب آپؐ دو سال کے ہوئے تو بچوں کے ساتھ کھیلنا بھی شروع کر دیا۔ ایک دفعہ بچوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک فرشتے حضرت جبرائیلؑ تشریف لائے اور آپؐ کو لٹا کر سینہ چاک کیا۔ پھر اس میں سے آپؐ کا دل نکالا اسے زم زم سے دھویا اور پھر اسے واپس رکھ کر جوڑ دیا۔ یہ انوکھا آپریشن دیکھ کر بچے گھبرا گئے اور دوڑ کر حلیمہ کو بلا لائے۔ حلیمہ جب پہنچیں تو آپؐ کو زندہ پایا۔ ان کو خطرہ محسوس ہوا اور انھوں نے آپؐ کو واپس والدہ کے پاس مکہ بھجوا دیا۔

اب آپؐ اپنی والدہ بی بی آمنہ کی آغوش میں آ گئے۔ ابھی آپؐ کی عمر چھ برس ہی تو ہوئی تھی کہ آپؐ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اب آپؐ کی پرورش آپؐ کے دادا عبدالمطلب نے شروع کر دی۔ عبدالمطلب آپؐ کو بہت پسند کرتے اور اپنی اولاد سے بڑھ کر آپؐ کو چاہتے تھے۔ آپؐ کی عمر مبارک آٹھ برس ہوئی تو آپؐ کے دادا جان اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اب آپؐ اپنے سگے چچا حضرت ابوطالب کے زیرِسایہ پرورش پانے لگے۔

یہ آپؐ کے وہی چچا تھے جنھوں نے آپؐ کی آخر دم تک بہت دیکھ بھال کی اور ہر مشکل مرحلے میں آپؐ کا بھرپور ساتھ دیا۔ آپؐ بارہ سال کے ہوئے تو ابوطالب آپؐ کو ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ شام لے گئے۔ راستے میں قافلے نے بصریٰ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ ان دنوں بصریٰ میں جرجیس نامی ایک راہب رہتا تھا۔ جو بحیرہ کے لقب سے مشہور تھا۔ اس قافلہ کی آمد پر یہ اپنے گرجے سے نکل کر قافلے کا استقبال کرنے آیا۔ اس سے پہلے وہ کبھی ایسا نہ کرتا تھا۔ اس نے آپؐ کو اوصاف حمیدہ سے پہچان لیا اور آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"یہ سید العالمین ہیں۔ اللہ نے انھیں رحمۃ العالمین بنا کر بھیجا ہے۔" ابوطالب نے پوچھا۔ "آپ کو کیسے

معلوم ہوا؟'' تو اس نے کہا کہ ''جب تم لوگ گھاٹی کی اس جانب نمودار ہوئے تو کوئی درخت یا پتھر ایسا نہ تھا جو سجدے میں نہ جھکا ہو، اور ایسا کسی نبی کی آمد پر ہی ہوتا ہے۔ اور میں نے انھیں مہر نبوت سے بھی پہچانا ہے۔ ان کا تذکرہ ہماری کتابوں میں بھی آیا ہے۔''

اس کے بعد اس راہب نے کہا کہ اسے ملک شام نہ لے جاؤ، واپس بھیج دو کیونکہ اسے یہود سے خطرہ ہے۔ چنانچہ ابو طالب نے بعض غلاموں کے ہمراہ آپ کو واپس مکہ بھیج دیا۔

آپ مکہ میں ہی پل بڑھ کر جوان ہوئے اور پاکیزہ اوصاف اور اخلاق کی بنا پر مکہ کی ہر دلعزیز شخصیت بن گئے۔ مکہ کے لوگ آپ کو صادق اور امین کہہ کر پکارنے لگے۔ آپ کا باقاعدہ کوئی پیشہ نہ تھا۔ اکثر تجارت کی غرض سے دوسرے شہروں کا سفر کرتے کیونکہ خاندان کے اکثر افراد تاجر تھے۔ فارغ اوقات میں بکریاں بھی چراتے تھے۔ مکہ کے اکثر افراد اپنی امانتیں آپ ہی کے پاس رکھواتے تھے۔

ان دنوں مکہ میں خدیجہؓ بنت خویلد نامی ایک بہت ہی معزز، مالدار اور تاجر خاتون بھی رہتی تھیں۔ انھیں جب آپ کی راست گوئی اور امانت داری کا علم ہوا تو آپ کو پیش کش کی کہ آپ ان کا سامان تجارت لے کر ان کے غلام میسرہ کی ساتھ تشریف لے جائیں۔ آپ نے یہ پیش کش قبول کی اور میسرہ کے ہمراہ ان کا سامان لے کر سفر پر روانہ ہوئے۔

جب آپ واپس مکہ تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ نے اپنے مال میں ایسی برکت دیکھی جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی تو میسرہ سے دریافت کیا۔ میسرہ نے دورانِ سفر آپ کے شیریں اخلاق، بلند پایہ کردار اور راست گوئی کے بارے میں اپنے مشاہدات بیان کیے۔ یہ سب سننے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے آپ تک شادی کا پیغام پہنچایا۔ آپ راضی ہوگئے اور پچیس سال کی عمر مبارک میں آپ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح کرلیا۔ یہ پہلی خاتون تھیں جن سے آپ نے شادی کی اور ان کی وفات تک کسی اور خاتون سے شادی نہ کی۔

آپ کو شروع ہی سے ان جھوٹے خداؤں سے نفرت تھی اور اپنی قوم کے ان فضول اور واہیات عقائد پر آپ کا دل مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ آپ کو تنہائی محبوب ہوگئی۔ آپ حق کی تلاش کے لیے کوہ حرا کے غار، غار حرا، میں چلے جاتے اور اکثر وقت وہیں پر عبادت اور غور و فکر میں مشغول رہتے۔

جب آپ کی عمر مبارک چالیس برس ہوگئی تو اللہ نے چاہا کہ اس کی مخلوق پر اس کی رحمت کا فیضان ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے مشرف کر دیا۔ ایک دن حسب معمول آپ غار حرا میں مشغول تھے کہ حضرت جبرائیلؑ (اللہ تعالیٰ کے ایک فرشتے) آپ کے پاس آئے اور کہا کہ ''پڑھو'' آپ نے فرمایا ''میں

پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' آپ فرماتے ہیں اس پر اس نے مجھے اتنی زور سے دبایا کہ میری قوت نچوڑ دی۔ پھر چھوڑ کر کہا ''پڑھو!'' میں نے پھر کہا ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس نے دوبارہ دبایا۔ پھر کہا ''پڑھو'' میں نے پھر کہا ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس نے تیسری بار دبایا پھر چھوڑ کر کہا۔

''پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا اور پڑھو تمھارا رب نہایت کریم ہے۔''

سورۃ العلق کی یہ ابتدائی آیات ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے آپ تک پہلی وحی کی صورت میں پہنچائیں۔ ان آیات کے ساتھ آپ گھر کی طرف پلٹے۔ آپ کا دل خوف کی وجہ سے دھک دھک کر رہا تھا۔ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے فرمایا ''مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔'' اُنھوں نے آپ کو چادر اوڑھا دی۔ یہاں تک کہ ڈر ختم ہوگیا۔

حضرت خدیجہؓ نے دریافت کیا تو آپ نے سارا ماجرہ سنا دیا۔ اس پر حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل نے آپ سے دریافت کیا تو آپ نے سارا واقعہ سنا دیا۔ یہ سب سن کر ورقہ بن نوفل نے کہا کہ ''یہ تو وہی فرشتہ ہے جو اللہ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام پر بھی آیا کرتا تھا۔ مایوس اور خوفزدہ نہ ہوں بلکہ ثابت قدم رہیں۔ خدا کی قسم! آپ اس امت کے نبی ہیں۔'' اس کے کچھ عرصہ بعد ہی ورقہ فوت ہوگئے اور وحی آنا بھی رک گئی۔

آپ ایک دفعہ کہیں جا رہے تھے کہ اچانک آسمان سے ایک آواز آئی۔ آپ نے آسمان کی طرف دیکھا تو حضرت جبرائیلؑ کو زمین و آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا پایا۔ آپ خوف زدہ ہو کر زمین کی طرف جھک گئے اور گھر پہنچ کر حضرت خدیجہؓ سے فرمایا۔

''مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو.....'' آپ کو چادر اوڑھا دی گئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات نازل فرما دیں جن کا مفہوم کچھ اس طرح سے ہے:

''اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔''

ان آیات میں جو احکامات آپ کو دیے گئے ہیں وہ تو نہایت ہی مختصر اور سادہ ہیں لیکن ان آیات میں ایک عظیم مقصد پوشیدہ ہے۔ گویا آپ کو جب اپنے نبی برحق ہونے پر یقین ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا کہ اے میرے بندے! تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کیوں گئے ہو؟ تم پر حق نازل کر دیا گیا ہے اور اب تمھارا یہ کام ہے کہ تم اوڑھ لپیٹ کر نہ لیٹو بلکہ اٹھو اور

دنیا کو بھی اس غفلت سے نکالو۔ ان لوگوں کو ان کے انجام سے ڈراؤ اور ان کو اللہ کی کبریائی اور بڑائی سمجھا دو۔ ان کو جھوٹے خداؤں کی بندگی اور غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی میں لے آؤ۔

یہ احکامات سننے کے بعد آپؐ اٹھ کھڑے ہوئے اور آخری دم تک کھڑے رہے اور اس کارِ عظیم کو انجام دیتے رہے۔ آپؐ جب اس مقصد کے لیے کھڑے ہوئے تو آپؐ نے بہت مظالم سہے۔ آپؐ کے کتنے ہی عزیز آپؐ کے دشمن ہو گئے۔ آپؐ کی راہوں میں کانٹے بھی بچھائے گئے۔ لیکن یہ مقصد اتنا عظیم تھا کہ آپؐ نے تمام مصائب و مشکلات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ انہی میں سے کچھ آپؐ کے ساتھ ہو گئے جو کسی قیمت پر اپنے مقصد کے حصول سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے۔ بہت سی جنگیں بھی ہوئیں۔ بہت سے اصحاب نے اس عظیم مقصد کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کیا اور بالآخر آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کی انتھک جدوجہد اور محنت شاقہ کی بدولت خلق خدا اللہ کی کبریائی کو جان گئی اور ایک طویل عرصے تک اللہ کے غلاموں نے اس دنیا پر حکومت بھی کی۔

جل جلالہ

آ رہا ہے جلد ہی
ہمیں تو پہلے ہی پتا تھا کہ اس میں ہوں گی

دلچسپ کہانیاں
انوکھے مضامین
مزیدار نظمیں

لیکن یہ سب تو ہوتے ہی ہیں
ان کے ساتھ ساتھ

سالنامہ ۲۰۱۵ء میں ہو گا

دلچسپیوں کا خزانہ
نیا انعامی سلسلہ
ریکارڈ ھی ریکارڈ
ناقابلِ یقین

انعامات کی بھرمار
مہم جوئیاں
معلومات کا انبار
ادب کا جھاں

تو پھر انتظار کیجیے نومبر ۲۰۱۵ء کے ایک زبردست سالنامے کا

آپ اپنی تحریریں ستمبر ۲۰۱۵ء کے اختتام تک ہمیں روانہ کر سکتے ہیں

بابائے کیمیا

۷۸۶ء کی بات ہے خلیفہ ہارون الرشید کے وزیر جعفر برمکی کو معلوم ہوا شہر کوفہ میں ایک دوا ساز رہتا ہے جو غریب ہونے کے باوجود نئی چیزیں ایجاد کرنے کے لیے تجربے کرتا رہتا ہے۔ اس نے اس دوا ساز کو بغداد بلوایا اور اس کا وظیفہ مقرر کر کے کہا کہ تم جو کام کر رہے اب اور توجہ اور محنت سے کرو۔ تمھیں جتنے سرمائے کی ضرورت ہوگی ہم دیں گے۔

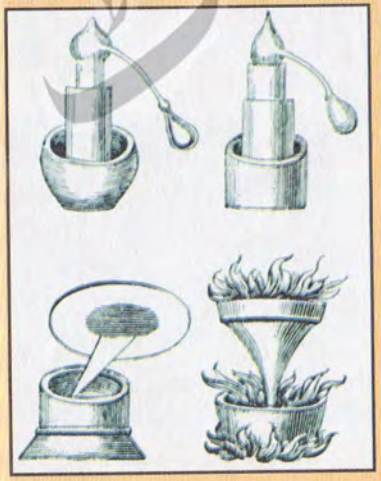

یہ دوا ساز جابر بن حیان تھا۔ اس کا باپ حیان بھی دوا ساز تھا لیکن سیاست میں حصہ لینے اور حکومت کی مخالفت کرنے کی وجہ سے اسے موت کی سزا ہوگئی تھی۔ جابر کا بچپن بہت تکلیفوں میں گزرا تھا۔ ایسے بچے عام طور پر علم سے محروم رہ جاتے ہیں لیکن جابر کو تعلیم حاصل کرنے کا ایسا شوق تھا کہ غربت اس کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکی۔ اس نے عربی زبان میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ فارسی اور یونانی زبانیں بھی سیکھیں اور بڑی عمر کو پہنچ کر تجربوں میں مصروف ہوگیا۔

مشہور کہاوت ہے 'ہمت مرداں مدد خدا' جب کوئی بھلائی کے لیے

کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کی مدد ضرور کرتا ہے، چنانچہ جابر کو ایک امداد تو یہ ملی کہ شاہی دربار سے اس کا وظیفہ مقرر ہوگیا، اس کے علاوہ دوسری خاص مدد یہ ملی کہ اللہ نے اس کا دماغ روشن کر دیا۔ جڑی بوٹیوں اور دھاتوں پر تجربے کرتے ہوئے اسے یہ راز معلوم ہوگیا کہ دنیا کی تمام دھاتیں، سونا، چاندی اور لوہا وغیرہ پارے اور گندھک کے ملاپ سے بنی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے یہ معلوم کیا کہ ہر چیز میں ایسا جوہر ہوتا ہے جو اسے مفید یا مضر بناتا ہے اور اس جوہر کو اس چیز سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ راز معلوم کرنے کے بعد اس نے ایک آلہ ایجاد کیا جس کا نام 'قرع انبیق' ہے۔ حکیم یہ آلہ آج کل بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کی مدد سے عرق نکالتے ہیں جو دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جابر بن حیان نے اس آلے کی مدد سے تین قسم کے تیزاب تیار کیے جو دھاتوں کو گلانے اور صاف کرنے میں کام آتے ہیں اور آج کل بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس بہت ہی مفید ایجاد کے علاوہ اس نے لیموں کا ست نکالنے، چمڑا رنگنے اور فولاد بنانے کے علاوہ کئی بلند پایہ کتابیں بھی لکھیں جن کے کئی زبانوں میں ترجمے ہوئے۔

جابر بن حیان کو پہلا مسلمان کیمیا دان مانا جاتا ہے۔ اس علم کو جو ترقی حاصل ہوئی ہے اس کی بنیادی باتیں اُنھوں نے معلوم کی تھیں۔ انگریزی زبان میں ان کا نام جبیر لکھا جاتا ہے۔

احمد حاطب صدیقی

بلی اور شمامہ کا قصہ

یہ بڑے مزے کا قصہ ہے
جو گھر کا پچھلا حصہ ہے
اُس حصہ کے ایک کونے میں
کپڑوں کے نرم بچھونے میں
اک بھوری بلی رہتی ہے
بلی سے شمامہ کہتی ہے
اے مانو میری بات سنو
پر سوچ سمجھ کے ساتھ سنو
میں روز تمھیں نہلاتی ہوں
یہ سُرخ ربن پہناتی ہوں
پھر پیالہ دھو کر لاتی ہوں
پیالے میں دودھ پلاتی ہوں

یا تازہ چھیچھڑے منگوا کر
خوب اچھی طرح سے دُھلوا کر
دیتی ہوں تُم کو کھانے کو
کھا پی کر بھوک مٹانے کو
میں جب بھی مچھلی کھاتی ہوں
چپکے سے تمھیں دے جاتی ہوں
کس پیار سے میں سمجھاتی ہوں
یہ سَو سَو بار بتاتی ہوں
مت گندی چیزیں کھاؤ تم
مت خود کو روگ لگاؤ تم
پر کیا تم عقل کی کچی ہو؟
ناں! تم تو اچھی بچی ہو!
پھر چوہے تم کیوں کھاتی ہو؟
کیوں منھ کو خون لگاتی ہو؟
سب چوہے گندے ہوتے ہیں
گندی نالی میں سوتے ہیں
تم گھنٹوں بیٹھی تکتی ہو
چوہوں کی تاک میں رہتی ہو
کب چوہا باہر آئے گا
کچھ چپکے چپکے کھائے گا
تُم کود کے آن دبوچو گی
پھر اُس کی گردن نوچو گی
پھر ہبڑ ہبڑ کھا جاؤ گی
یوں اپنی حرص مٹاؤ گی
بے کار ہے تُم کو سمجھانا
کچھ ڈھنگ سلیقہ سکھلانا

یہ بات شامہ کی سُن کر مانو نے کہا: باجی بہتر
میں آپ کا کہنا مانوں گی سب بُرا بھلا پہچانوں گی
پَر آپ مجھے سمجھاتی ہیں خود الّم غلّم کھاتی ہیں
''چنگم'' دِن رات چباتی ہیں یا لالی پاپ اُڑاتی ہیں
قُلفی فالودہ دہی بڑے بازار کے چھولے گلے سڑے
بس کھانے پر جب آتی ہیں سب اَلا بَلا کھا جاتی ہیں
پھر پیٹ پکڑ کر روتی ہیں اور درد سے بے کَل ہوتی ہیں
تب کڑوی گولی ملتی ہے انجیکشن سوئی لگتی ہے
اب اور بھلا کیا بتلاؤں
بس میاؤں میاؤں می آؤں

اب ہو کے شامہ شرمندہ بولی کہ چلو بس آئندہ
ہم مل کے ارادہ کرتے ہیں یہ پکا وعدہ کرتے ہیں
بس اچھی چیزیں کھائیں گے
اور کھا کر جان بنائیں گے

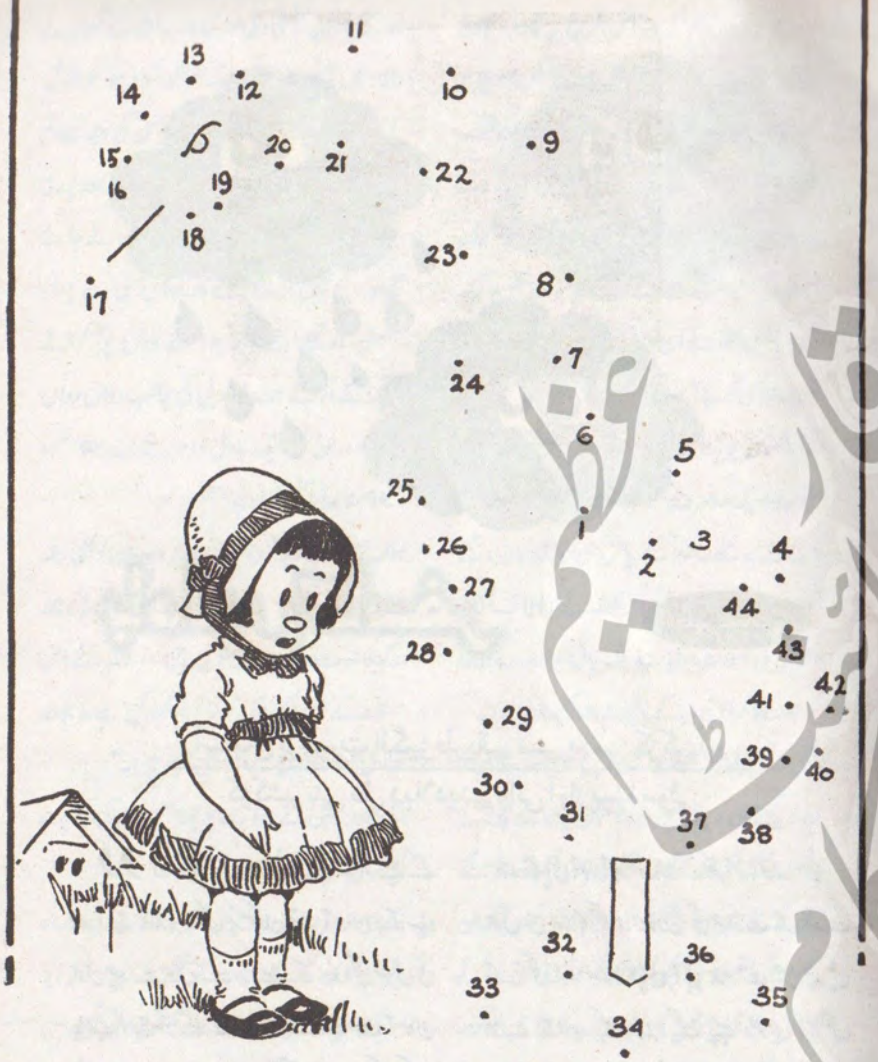

مجھے معلوم ہے تم یہیں کہیں ہو۔ شرافت سے باہر آجاؤ اب بنومت اور باہر نکل آؤ۔ سچ کہہ رہی ہوں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔ نائلہ کی بطخ کھوگئی ہے اور وہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کررہی ہے۔ ذرا آپ نائلہ کی مدد کرکے بطخ کی شرارت تو ناکام بنائیں۔

بادلوں کا سفر

اظہر عباس

آسمان پر حیرت انگیز طریقے سے بجلی کڑکی اور کڑکتے ہی دل دہلا دینے والی آواز پیدا ہوئی

دو روز کی مسلسل طوفانی لہروں میں رہنے کے بعد آج سمندر بالکل پُرسکون تھا۔ آسمان کے سیاہ بادل پورے جوش سے برسنے کے بعد اگلی منزل کی جانب کوچ کر گئے تھے۔ جس کے باعث آسمان بالکل صاف اور شفاف اپنے حقیقی رنگ میں نکھرا نکھرا نظر آ رہا تھا اور اس پر سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا اور سنہری کرنیں بکھیر رہا تھا اور سمندر کا پانی اُجلا اُجلا اور شفاف نظر آ رہا تھا۔

جوں ہی اللہ کا حکم ہوا سورج کی حرارت میں شدت آنے لگی اور سمندر کا پانی آبی بخارات میں تبدیل ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے دھویں کی شکل اختیار کرتے ہوئے فضا میں بلند ہونے لگے اور کچھ ہی دیر میں چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے شکل اختیار کرتے ہوئے ہوا میں معلق ہونے لگے۔ پھر ہوا کو حکم ہوا کہ

ان بخارات کو ٹھنڈا کرو۔ اس طرح یہ چھوٹی چھوٹی بدلیاں گہرے بادلوں میں تبدیل ہونے لگیں اور پوری فضا میں ہلکے اور گہرے بادل پھیل گئے اور مختلف اشکال میں نظر آنے لگے۔ اتنی بلندی سے جب بدلیوں نے نیچے سمندر کی سطح کو دیکھا تو ہلکا سا خوف محسوس کیا مگر اگلے ہی لمحے ان کا یہ خوف ختم ہو گیا۔ کیونکہ جس اللہ نے ان کو بنایا تھا۔ وہ سب کا خالق بھی تو ہے جو کسی کو بے آسرا نہیں چھوڑتا۔

نیلے آسمان پر بادل بہت خوبصورت منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو وجود میں آنے پر مبارکباد بھی دے رہے تھے۔ ان کے پاس ہی موجود بادل کے ایک بڑے ٹکڑے نے کہا: ''اللہ نے نہ صرف ہمیں دھویں کی صورت بنایا ہے بلکہ پانی کو ہمارے وجود کا حصہ بنا کر اس دنیا کے لیے رحمت بھی بنا دیا ہے۔

ابھی تک بادلوں کے وجود میں آنے کا سلسلہ جاری تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے آسمان پر بڑے چھوٹے بادلوں کے ٹکڑے مختلف شکلوں میں نظر آنے لگے تھے۔ اتنے میں ہوا کو حکم ہوا کہ ان بادلوں کو لے کر ان کی منزل مقصود پر پہنچو، اللہ کا حکم ہوتے ہی ہوا نے چلنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے بادلوں میں حرکت پیدا ہوئی..... تو ایک لمحہ کو نیلے آسمان پر پھیلے چھوٹے بادل گھبرا سے گئے کیونکہ یہ پہلی حرکت ان کے لیے بالکل نئی اور حیران کن تھی۔

ہوا نے بادلوں کو تسلی دی اور کہا جب اللہ نے تمھارے وجود میں آبی بخارات کے ساتھ گرم ہوا کو شامل کیا تو..... تم وزن میں ہلکے ہو گئے جس کی وجہ سے تم سطح سمندر سے بلند ہو کر فضا میں اُڑنے لگے اور پوری تسلی رکھو وہ اللہ تم کو اُڑاتا ہوا بلندیوں تک لے جائے گا اور نیچے نہیں گرنے دے گا۔ ہوا کی تسلی سے بادل مطمئن ہو گئے تھے اور ہوا کے دوش پر مسکراتے مسکراتے اُڑتے ہوئے منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ دوران سفر ایک بادل دوسرے سے بولا: ''وہ دیکھو سمندر کی سطح پر کیا ہے؟''

ہوا نے جواب دیا: ''وہ مچھلیاں ہیں اور ان کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے..... یہ جو تم کو نظر آ رہی ہیں یہ وجود کے لحاظ سے بہت بڑی بڑی ہیں..... اللہ نے اس سمندر کے اندر بھی ایک دنیا آباد کر رکھی ہے۔ بہت ساری مخلوقات اس کے اندر بھی آباد ہیں۔''

ایک اور بادل نے ہوا سے پوچھا: ''سمندر کی سطح پر وہ بڑا سا کیا ہے۔''

''وہ سمندری جہاز ہے جو انسانوں نے بنایا ہے اور وہ مال برداری کے لیے سمندر کے متعین کردہ راستوں پر سفر کرتا ہے۔'' بادلوں اور ہوا کی گفتگو جاری تھی۔ اس دوران سورج ان سے دور جا چکا تھا۔ اندھیرے گہرے ہونے لگے تھے۔ شام کا منظر کتنا خوبصورت تھا۔

یہ سب کچھ آج ہی وجود میں آنے والے بادلوں کے لیے بالکل نیا اور خوبصورت تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو اندھیرا چھا گیا۔ بادل ساری رات مسافت طے کرتے رہے اور صبح کا اُجالا ہونے کو تھا۔ اُجالا ہوتے ہی بادلوں کی نظر جب نیچے پڑی تو سمندری حدود پار کر چکے تھے۔ ایک بڑے بادل نے دوسرے سے سوال کیا کہ ہمارے باقی ساتھی بادل کہاں گئے، اگرچہ اس وقت بھی آسمان ہلکے بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ بادل جواب دیتا..... ہوا یک دم بولی: ''اللہ نے اُن کے لیے کسی اور منزل کا تعین کر رکھا تھا اس لیے وہ وہاں چلے گئے ہیں اور ہم اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں۔

سورج پوری آب و تاب سے دوبارہ چمکنے لگا تھا۔ بادلوں کا سفر مسلسل جاری تھا۔ نیچے کا منظر بدل چکا تھا۔ یہاں گرمی کی شدت بہت زیادہ تھی۔ اس وقت ان کا گزر ایک انسانی آبادی سے ہو رہا تھا۔ یہ میدانی علاقہ شدت گرمی سے تپ رہا تھا۔ بادلوں نے سوچا کہ اس زمین پر بسنے والے غریبوں کی مدد کی جائے مگر کیسے..... کیونکہ وہ کچھ دیر کے لیے رکے تھے اور سایہ بن کر گرمی کی شدت کو کم کر رہے تھے۔ جس سے معصوم بچوں کے چہرے کھل اُٹھے تھے وہ چاہتے تھے کہ اتنی گرمی میں جل تھل بارش ہو اور موسم خوشگوار ہو جائے مگر ابھی نہیں..... ان کی فصل تیار ہے۔ اگر یہ بادل یہاں برس گئے تو ان کی لہلہاتی فصل خراب ہو جائے گی..... بادل ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ہوا کا حکم ہوا اور بادلوں کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ایک بادل بولا: ''وہ گرمی سے بلکتے بچے ان کو شائد ضرورت ہے ہماری۔'' ہوا نے جواب دیا..... ''یہ سوچنا ہمارا کام نہیں۔''

اس وقت بادلوں کا گزر جہاں سے ہو رہا تھا وہاں گرمی کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ سورج کی تپش سے زمین کی سطح جل رہی تھی۔ لوگ اس جھلسا دینے والی گرمی میں بے ہوش ہوتے جا رہے تھے۔ بظاہر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ گرمی سے مر ہی جائیں گے۔ یہ غریبوں کی بستی تھی..... بادلوں نے سوچا کہ بڑھ کر ان کی مدد کرتے ہیں..... مگر ہوا بولی: ''ایسا ممکن نہیں کیوں کہ یہ تمھارے اختیار میں نہیں..... ہم سب اللہ کے تابع ہیں.....''

ایک چھوٹا بادل بولا: ''ان کو ضرورت ہے..... ہمیں ان کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔''

ہوا، بادل سے مخاطب ہو کر بولی: ''یہ لوگ اللہ کے نافرمان ہیں گزشتہ برس یہاں خوب بارش ہوئی ان کی فصل بھی اچھی ہوئی اور موسم بھی خوب رہا مگر یہ بھول بیٹھے اللہ کو اور یہ سب نافرمانی کرنے لگے اُنھوں نے اپنی فصل میں اپنے ہی بھائیوں کا حق نہیں رکھا اور کہنے لگے یہ سب کچھ تو ان کی اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔ جب کہ وہ سب کچھ اللہ کی رحمت تھی۔ اس سے قبل کہ چھوٹا

بادل نیچے کی جانب حرکت کرتا جوان کی مدد کا سوچ رہا تھا اسے یک دم خیال آیا کہ جس وقت اللہ کے حکم سے یہ وجود میں آ رہے تھے تو سمندر نے ان کو نصیحت کی تھی کہ غلطی سے بھی بڑھ کر زمین کے قریب مت ہونا ورنہ تم فنا ہو جاؤ گے..... یہ سوچتے ہی بادلوں نے ہوا میں جھولنا شروع کر دیا اور تیزی سے اس بستی سے گزرنے لگے اور بستی کے لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔

سورج نے دوبارہ اللہ کے حکم کے پابند تھے، بادل جاتے جاتے ان سے کہہ رہے تھے: ''اے زمین پر بسنے والے لوگو اللہ سے توبہ کرو اور اُس کی رحمت مانگو۔''

بادل ہوا کے ہمراہ مسلسل حرکت میں تھے اور اُڑتے اُڑتے وہ ایسی وادیوں اور کھائیوں میں پہنچ چکے تھے جہاں کا موسم معتدل تھا۔ آسمان پر پہلے سے موجود بادل بھی اِنھیں بادلوں میں یکجان ہونے لگے تھے۔ بادلوں کی حرکت میں یہ تیزی گزشتہ رات سے آئی تھی۔ ہوا نے تیزی دکھائی تو بادل ڈگمگانے لگے تھے جس کی وجہ سے چھوٹے بادل پریشان ہوئے تو ان کو حکم ہوا کہ آپس میں مل جاؤ اور ایک دوسرے کی طاقت بن جاؤ..... آپس میں ملتے ہی بادل تہہ بہ تہہ ہو گئے اور ان کی طاقت میں اضافہ ہونے لگا اس طرح یک جان ہو کر وہ تیز ہواؤں کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔

اس وقت بادل ہواؤں کا سفر پہاڑوں، گھاٹیوں، ندی، نالوں اور دریاؤں کے اوپر تھا۔ خوبصورت جنگلات اس کے چرند پرند، اللہ کی زمین پر پھر رہے تھے۔ ایک بادل ہوا سے بولا: ''اے کاش میں بھی اس خوبصورت وادی اور پہاڑوں کا حصہ ہوتا۔''

ہوا نے فوراً بادل کو ٹوکا اور کہا: ''اللہ نے ہر چیز کو ٹھیک اور صحیح مقام پر پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اللہ کو ایسی باتیں پسند نہیں..... اے بادل تم کیا جانتے ہو یہ جو چیزیں آج تمھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہیں یہ وادیاں، یہ پہاڑ، یہ دریا، یہ چرند، یہ پرند، ان سب کی زندگی کا انحصار ہم ہی پر ہے۔ اس ساری گفتگو کے دوران بادل بہت گہرے ہو چکے تھے۔ یہ پہلے سفید تھے پھر رنگ سرمئی ہوا اور آخر میں گہری سیاہ رنگت اختیار کر لی..... بادلوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اچانک حیرت انگیز طور پر اتنے مضبوط اور طاقت ور ہو جائیں گے اور ان وادیوں پر چار سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر کسی پرندے کی مانند سر اُٹھائے اور پر پھیلائے اس وادی پر محو پرواز ہوں گے۔ زمین پر اُگے درخت اور گھاس نظریں بچھا کر ان بادلوں کا استقبال کریں گے، یہ سارا منظر دیکھ کر بادل خوشی سے چلایا: ''میں اللہ کے حکم سے اور اس کی رضا سے اپنی زندگی کو تمھارے لیے فنا کرتا ہوں اور میرے وجود میں موجود پانی جو تمھارے لیے زندگی ہے۔ اس کو تم پہ قربان کرتا ہوں۔''

بادلوں نے ابھی یہ الفاظ ادا ہی کیے تھے کہ آسمان پر حیرت انگیز طریقے سے بجلی کڑکی اور بادلوں کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھی حس سے بادل گرجے اور کڑکتے ہی دل دہلا دینے والی آواز پیدا ہوئی۔ بادلوں نے ان سب کی محبت میں اپنے آپ کو فنا کیا اور بارش کی صورت رحمت بن کر زمین کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ بارش تو بادلوں کے پاس امانت تھی۔ یہ بظاہر ان کی موت تھی مگر یہ بادلوں کی عظمت بھی تھی۔ زمین کو جل تھل کر دینے کے بعد پورے علاقے میں قوس قزح گنبد کی مانند پھیل گئی تھی اور جنت کی چمکتی دمکتی شعاعوں کے رنگ، بادلوں کو اس کی اس قربانی پر مبارکباد پیش کر رہے تھے۔ سمندر کا کھارا پانی شفاف ہو کر وادی کے ندی، نالوں اور چشموں سے ہوتا ہوا پہلے چھوٹے اور پھر بڑے دریاؤں میں آ گرا اور دریاؤں سے ہوتا سارے راستے زندگی کے رنگ بکھیرتا ہوا واپس سمندر کے وجود کا حصہ بن گیا۔ پھر سے اللہ کے حکم کا انتظار کرنے لگا کہ کب اس کا حکم ہو اور یہ پانی دوبارہ بادل بن کر اپنا سفر شروع کرے اور اس دنیا میں بسنے والی اللہ کی پیدا کردہ ہر چیز کے لیے زندگی اور اُمید کا پیغام لے کر چلے۔

قارئین ساتھی کے حسِ مزاح کو جانچنے کے لیے ماہنامہ ساتھی نے شروع کیا ہے۔ ان کے لیے ایک انعامی سلسلہ۔ جس میں ہر ماہ بہترین اور دلچسپی سے بھرپور لطیفے بھیجنے والے قارئین ساتھی کو **ڈیئر پنسل** اور بال پین بنانے والے ادارے **انڈس پنسل انڈسٹریز** کی جانب سے دیا جائے گا خوبصورت تحفہ..... تو پھر قلم سنبھالیے اور مزاح کے اس دوڑ میں شامل ہو جائیں..... جہاں ''ذرا کھلکھلائیے'' آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ نوٹ: لطیفہ روانہ کرتے ہوئے اس پر اپنا نام، مکمل پتا اور فون نمبر لکھنا مت بھولیے گا۔

DEER PENCIL

اپنا گھر

ایک آدمی اپنے دوست کے گھر گیا۔ بیل بجانے پر چھوٹا سا بچہ باہر نکلا۔

آدمی: ''بیٹا! آپ کے ابو گھر پر ہیں؟''

بچہ: ''جی وہ تو باہر گئے ہیں۔''

آدمی: ''اچھا اپنے بڑے بھائی کو بلاؤ۔''

بچہ: ''وہ کرکٹ کھیلنے گئے ہیں۔''

آدمی: ''اچھا تمھاری امی تو گھر پر ہوں گی؟''

بچہ: ''جی وہ پڑوس میں گئی ہیں۔''

وہ آدمی جل کر بولا: ''تو بیٹا آپ کیوں گھر پر ہو آپ

بھی کہیں جاؤ۔"

بچہ بولا: "میں بھی اپنے دوست کے گھر ہی آیا ہوا ہوں۔"

مرسلہ: محمد ذیشان خان، کراچی

☆.....☆

انعامی لطیفہ

بڑی آفت

ایک گاؤں میں شدید سیلاب آ گیا۔ ایک کنبے نے اپنا چھوٹا بچہ دور رشتے دار کے پاس بھیج دیا کہ وہ وہاں حفاظت سے رہ سکے۔ دو روز بعد بچے کے والدین کو تار موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔

"بچے کو واپس بھجوا رہا ہوں، اس کے بجائے سیلاب بھیج دیں۔"

مرسلہ: بشین جاوید بسام، کراچی

☆.....☆

زہر

دو دوست ایک جگہ بیٹھ کر حلوا کھا رہے تھے کہ ان کا ایک مفت خور دوست وہاں آن دھمکا اور کہنے لگا: "تم لوگ کیا کھا رہے ہو؟"

ایک دوست جل کر بولا: "زہر"

مفت خور بولا: "تم دونوں کے بعد میں جی کر کیا کروں گا۔" یہ کہہ کر مفت خور دوست بھی حلوہ کھانے میں شامل ہو گیا۔

مرسلہ: عرشیہ نوید حسنات، کراچی

☆.....☆

اک نئی ڈش

ایک دیہاتی پہلی بار شہر کے کسی ہوٹل میں گیا اور بیرے سے گوشت کے سالن کی فرمائش کی۔

بیرا: "آج گوشت کا ناغہ ہے۔"

دیہاتی: "اچھا تو ایسا کرو کہ دو روٹی کے ساتھ گوشت کا ناغہ ہی لے آؤ۔"

مرسلہ: نامعلوم

☆.....☆

تعریف

تین بچے اپنے اپنے ابو کے دانتوں کی تعریف کر رہے تھے۔

پہلا: "میرے ابو کے دانت دودھ کی طرح سفید ہیں۔"

دوسرا: "میرے ابو کے دانت ہیرے کی طرح چمکدار ہیں۔"

تیسرا: "میرے ابو کے دانت جادوئی ہیں کبھی میز پر ہوتے ہیں تو کبھی منہ میں۔"

مرسلہ: نائمہ تحریم، کراچی

☆.....☆

اسٹینڈ بائے

ایک شخص مسجد کے وضو خانے میں داخل ہوا اور بیٹھ کر وضو کرنے لگا۔ ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے اسے دو بار وضو کرتے ہوئے دیکھا تو اس سے

پوچھا۔ "بھائی آپ نے دو بار وضو کیا، اس کی کوئی خاص وجہ؟"

وہ بولا: "اگر ایک ٹوٹ گیا تو دوسرا کام آئے گا۔"

مرسلہ: محمد ذیشان خان، کراچی

☆.....☆

واپڈا آفس

ایک آدمی واپڈا کے آفس کے سامنے کھڑا غصہ کر رہا تھا۔

دوسرا آدمی: "کیا ہوا غصہ کیوں کر رہے ہو؟"

پہلا آدمی: "میں منڈی میں بکرا لینے گیا وہاں بجلی ہی چلی گئی، میں اندھیرے میں گدھا لے کر آ گیا۔"

مرسلہ: ماہ رخ، حیدر آباد

☆.....☆

غلطی

مریض ڈاکٹر سے: "آپ ہر بار میرا غلط دانت نکال دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر: "آپ پریشان نہ ہوں اس بار میں ان شاء اللہ ٹھیک دانت نکالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔"

مریض: "وہ کیسے؟"

ڈاکٹر: "کیوں کہ ہر بار میں ٹھیک دانت ہی نکالتا تھا، اب آپ کے منہ میں ایک ہی دانت بچا ہے شاید یہی وہ دانت ہے جس میں آپ تکلیف محسوس کرتے ہیں۔"

مرسلہ: جویریہ حبیب الرحمٰن، کراچی

☆.....☆

ہمدردی

ایک سیاح ریسٹورنٹ میں گیا تو بیرے نے آ کر آرڈر لیا۔ سیاح نے فرائی مچھلی منگوائی۔

بیرا مچھلی لے آیا اور اس نے پوچھا، "اور کچھ؟"

سیاح نے کہا: "ہمدردی کے دو بول۔"

بیرا اپنا منہ سیاح کے کان کے قریب کر کے بولا: "مچھلی نہ کھانا دو دن کی باسی ہے۔"

مرسلہ: حیان مرزا، حیدر آباد

☆.....☆

اشارہ

استاد (شاگرد سے): "دو میں سے دو نکالیں تو کتنے بچتے ہیں؟"

شاگرد: "یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا کوئی اشارہ دیں۔"

استاد: "دیکھو! تمھارے پاس دو روٹیاں ہیں، تم نے دونوں روٹیاں کھالیں تو تمھارے پاس کیا بچا؟"

شاگرد: "سالن۔"

مرسلہ: طلحہ عرفان، کراچی

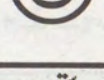

آئیڈیا ہمارا۔ کہانی آپ کی

علینہ کنول، بلال پبلک اسکول، ریڑھی گوٹھ

''ارے گلی میں کچرا کیوں پھینک رہے ہیں؟'' یہ ہمدانی صاحب تھے۔ اِنھیں محلے کا کونسلر بننے کا بے حد شوق تھا۔ مگر اہلِ محلّہ ان کے ہر وقت ٹوکنے کی عادت سے اس قدر عاجز تھے کہ ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دے رہے تھے۔

''تو کہاں پھینکوں؟ گھاس کاٹی ہے اپنے باغیچے کی۔ اب کٹی ہوئی گھاس کھانے سے تو رہا۔'' یہ وسیم صاحب تھے جو ریٹائرڈ ہونے کے بعد اب بس باغیچے کو کاٹ چھانٹ کر وقت گزاری کرتے تھے۔

''مگر گلی کی صفائی کا تو کچھ خیال کریں نہ جناب!!'' ہمدانی صاحب بھی کہاں ہار ماننے والے تھے۔

''میاں! تمھیں کوئی کام نہیں دنیا میں لوگوں کو نصیحت کرنے کے۔ گلی کے کچرے کا ٹھیکہ ہم نے تو نہیں لیا ہوا۔ آخر حکومت کی بھی تو کچھ ذمہ داری ہے کہ نہیں۔'' وسیم صاحب کی بہو نے آج ناشتہ بنانے میں دیر لگا دی تھی۔ اب خالی پیٹ وسیم صاحب کو بھلا نصیحت کہاں ہضم ہوتی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دے مارا۔ عجیب بات ہے آپ تو بلاوجہ برہم ہو رہے ہیں جناب۔ جو کام ہم خود کر سکتے ہیں اس کے لیے حکومت کا انتظار کیوں کریں۔ گلی ہماری..... محلّہ ہمارا تو صفائی کی ذمہ داری بھی ہماری ہوئی ناں۔'' ہمدانی صاحب کو تو سنہری موقع ہاتھ لگ گیا تھا تقریر کرنے کا۔

''تو پھر آپ کے حساب سے تو یہ وطن بھی ہمارا ہے تو میں خود کو وزیرِ اعظم سمجھ لوں اور بیرونی دوروں پر نکل جاؤں۔'' وسیم صاحب کے پیٹ میں دوڑتے چوہے اِنھیں تلملانے پر مجبور کر رہے تھے۔

''جاؤ بھائی اپنا راستہ ناپو۔ بڑے آئے صفائی کے ٹھیکیدار۔''

گھر کے اندر سے بہو نے آواز دی: ''ناشتہ تیار ہے ابا جان آ جائیں۔'' وسیم صاحب نے ہمدانی صاحب کو وہیں چھوڑا اور ناشتے کی طرف لپکے۔

ہمدانی صاحب حیران اس سوچ میں ڈوب گئے کہ یہ سوچ ایک پڑھے لکھے شخص کی ہے تو ایک عام شہری جو تعلیم کے زیور سے آراستہ نہیں ہے وہ اس معاشرے کو گندہ کرنے کے لیے کس قدر خطرناک چیزیں راستوں پر لا پٹختا ہوگا۔ گھر آ کر بھی طبیعت کو کسی طرح چین نہ آیا۔ اُنھوں نے وسیم صاحب کی غلط سوچ کو سدھارنے کے لیے ایک ڈراما تیار کیا۔ اور ڈرامے کے کردار تھے وسیم صاحب کے پڑوسی۔

یہ ایک ایسا محلّہ تھا جہاں ہر گھر کے باہر ایک چھوٹا سا باغیچہ موجود تھا۔ جس میں لوگ مختلف پھول اور پودے لگا کر اپنے گھر کی رونق دوبالا کرتے تھے۔

ہمدانی صاحب نے وسیم صاحب کے سامنے والے گھر اور برابر والے دو گھر کے مالکان سے رابطہ کیا اور اپنے ڈرامے کے بارے میں اِنھیں آگاہ کیا۔ وہ لوگ چونکہ وسیم صاحب کی کچرا گلی میں پھینکنے کی عادت سے نالاں تھے لہٰذا ہمدانی صاحب کا ساتھ دینے کے لیے راضی ہو گئے۔

اگلی صبح وسیم صاحب اُٹھے اور حسبِ معمول اپنے باغیچے کا رخ کیا۔ ابھی وہ آرام دہ کرسی پر براجمان ہوئے ہی تھے کہ برابر والے مکان کی دیوار سے کٹے ہوئے سوکھے پتے اور گھاس سے بھرا ایک ٹوکرا ان کے باغیچے میں کسی نے انڈیل دیا۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ سارا کچرا نہ صرف وسیم صاحب کے باغیچے میں پھیل گیا بلکہ وسیم صاحب خود بھی سوکھے پتوں کی بارش میں نہا گئے۔ ابھی وہ سمجھ ہی نہ پائے کہ آخر ہوا کیا ہے تو دوسری طرف کے مکان کی دیوار پر سے کسی نے کٹی گھاس اور سوکھے پتے ان کے باغیچے میں اُلٹ دیئے۔ اب تو وسیم صاحب چراغ پا ہو گئے۔ غصے میں گھر سے باہر نکلے تو دیکھا سامنے والے ہاشمی صاحب نکلے اور کٹی ہوئی گھاس سے بھری گھاس کاٹنے والی مشین آ کر عین ان کے گھر کے سامنے رستے پر خالی کر دی اور جانے لگے۔

''ارے کیا آپ سب لوگ پاگل ہو گئے ہیں؟ اپنے گھروں کا کچرا دوسرے کے گھروں کے سامنے کیوں پھینک رہے ہو؟''

وسیم صاحب غصے میں آگ بگولا ہوئے جا رہے تھے۔ وہ چیخ بھی رہے تھے اور اپنے سر اور جسم پر اَٹکے سوکھے پتے بھی جھاڑ رہے تھے۔

''کیا ہوا؟ وسیم صاحب! خیریت تو ہے؟ آج صبح صبح کیوں چلّا رہے ہیں؟'' ہاشمی صاحب مشین سمیت وہیں رک گئے۔

''میں پوچھتا ہوں آخر مسئلہ کیا ہے؟ تمھیں نظر نہیں آتا کہ اس رستے سے میرا آنا جانا ہے تم یہاں پر کچرا کیوں ڈال رہے ہو؟؟ ساری گلی سوکھی گھاس سے بھر دی ہے تم نے۔''

وسیم صاحب نے گلی میں ہر طرف پھیلی گھاس کی

طرف قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''گھاس کاٹی ہے اپنے باغیچے کی۔ اب کٹی ہوئی گھاس کھانے سے تو رہا۔'' یہ وہ ڈائیلاگ تھے جو کل وسیم صاحب نے ہمدانی صاحب سے کہے تھے اور آج ہاشمی صاحب ان کی ہی زبان میں ان سے بات کر رہے تھے۔

وسیم صاحب بغلیں جھانکنے لگے۔ مگر ابھی ان کا غصہ ان صاحبان پر باقی تھا جنھوں نے ان کے باغیچے میں کچرا پھینکا تھا۔ وہ پیچھے مڑے تو وہ دونوں تھے۔ وسیم صاحب ان کی طرف لپکے۔

''آپ لوگوں کو کچھ احساس اور تمیز ہے؟ آپ لوگوں نے کس طرح جرأت کی میرے گھر میں کچرا پھینکنے کی۔''

''ہم نے تو اپنا گھر صاف کیا ہے۔ اب دوسرے کا گھر خراب ہو یا اس کو تکلیف پہنچے یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ کیوں بھائی درست کہا نا میں نے؟'' ایک صاحب نے دوسرے سے پوچھا۔

''جی ہاں بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ لیا ہے دوسروں کے گھروں کا۔ ہماری بلا سے کسی کو تکلیف ہوتی ہے تو ہوتی رہے ہمارا گھر تو چمچما رہا ہے جی۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ اپنا گھر صاف کرنے کے لیے آپ دوسروں کو اذیت دیں گے؟''

''جی وسیم صاحب! یہ آپ سے ہی تو سیکھا ہے، اپنا باغیچہ صاف رہے۔ گلی محلہ، شہر یا وطن۔ گندہ ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ ارے ہم تو آپ ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جو آپ نے مجھے سکھایا۔ میں نے انھیں سکھایا۔ اور ان سے دوسرے سیکھیں گے۔ پھر کسی کا گھر گندہ ہو تو وہ خود صاف کرے گا۔ محلہ یا وطن گندہ ہوگا تو حکومت صاف کرے گی۔ کیوں؟ وسیم صاحب درست کہا نا میں نے!'' یہ ہمدانی صاحب تھے۔ جنھیں دیکھ کر وسیم صاحب سب سمجھ گئے۔

''صرف اپنے گھر کا کچرا ہم درست طریقے سے ٹھکانے لگائیں گے تو ساری گلی صاف رہے گی اور اگر ہر گلی صاف ہوگی تو پورا شہر صاف رہے گا پھر پورا وطن چمکنے لگے گا۔ کوئی ہمارا گھر صاف کرنے آتا ہے یا ہم خود صاف کرتے ہیں۔ اسی طرح وطن بھی ہمارا گھر ہے۔ اسے بھی ہم خود صاف کریں گے دوست۔''

وسیم صاحب شرمندہ تھے۔ اگلے دن سب نے دیکھا کہ ان کا گھر اور ان کی گلی سب سے زیادہ چمک رہی تھی۔ یہ تو شروعات ہے۔ ابھی تو پورا وطن جگمگانا باقی ہے۔

چاند رات بھر سفر کرتے اب ڈوب جانے کو تھا۔ اندھیری رات میں تیزی سے سفر کرتا یہ قافلہ اب منزل کے قریب ہی تھا۔ ان کی منزل قبیلہ ''طے'' تھی جہاں اللہ کے جانباز ایک ''کلس'' نام کے بت کو گرانے جا رہے تھے جو کہ حاتم طائی کے محلے میں تھا، وہی حاتم طائی جس کی سخاوت کی داستانیں آج تک مشہور ہیں۔

اب یہاں کا سردار حاتم طائی کا بیٹا عدی بن حاتم تھا، جس نے عرب میں تیزی سے پھیلنے والے ایک نئے دین کے بارے میں کافی خبریں سن رکھی تھیں اور یہ بھی کہ مدینے کے سردار نے پیش گوئی کی ہے کہ ایک دن سردار عدی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہوگا۔

یہ بات سب جگہ مشہور تھی کہ سردار مدینہ کی کہی ہوئی کوئی بات غلط نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ خبر سن کر عدی بن حاتم دہشت زدہ ہوگیا اور اپنے غلام کو سفر کی تیاری رکھنے کا حکم دیتے ہوئے ہدایت کی کہ جیسے ہی سردار کے لشکر کے بارے میں معلوم ہو مجھے فوراً خبر کی جائے۔

آخر ایک دن غلام بھاگا بھاگا آیا اور 'کلس' کے گرائے جانے کی خبر دی، سفر کی تیاری تو پہلے ہی تھی لیکن

حاتم طائی کا بیٹا

عُظمیٰ ابُونصر صدّیقی

آخر ایک دن غلام بھاگا بھاگا آیا اور 'کلس' کے گرائے جانے کی خبر دی

افراتفری میں عدی بن حاتم کی بہن سفانہ بنت حاتم بچھڑ گئیں اور مسلمانوں نے اُنھیں باقی قیدیوں کے ساتھ مدینے پہنچا دیا۔

جب اُنھیں سردار مدینہ کے سامنے پیش کیا گیا تو اُنھوں نے سردار سے اپنی رہائی کے لیے درخواست کی.....

سردار نے پوچھا: ''تمھارا نگران کون ہے؟''

سفانہ نے جواب دیا: ''میرا بھائی عدی بن حاتم.....''

سردار مدینہ بولے: ''وہی عدی جو اللہ اور اس کے رسول سے بھاگا ہے؟''

سفانہ نے 'ہاں' میں جواب دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم آگے بڑھ گئے، دوسرے دن پھر یہی سب بات چیت ہوئی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھر وہی جواب دے کر آگے بڑھ گئے۔ تیسرے دن اُنھوں نے پھر وہی درخواست کی، ساتھ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی سفارش کی اور پھر سردار کے کہنے پر سفانہ بنت حاتم کو ان کے مرتبے کے مطابق لباس، سواری اور سامان کے ساتھ ان کے بھائی کے پاس روانہ کر دیا۔

عدی بن حاتم اپنی بہن کو اتنے احترام اور اہتمام کے ساتھ اپنے گھر کے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئے اور سوچنے لگے کہ یہ میری بہن کہاں؟ وہ تو مسلمانوں کی قید میں ہے؟ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کو اپنی بہن کی آواز آئی! ''عدی تم کتنے ظالم ہو کہ اپنے اہل و عیال کو تو لے آئے اور حاتم کی بیٹی کو تنہا چھوڑ دیا۔''

بہن کی بات سن کر عدی بہت شرمندہ ہوئے اور اپنی غلطی کی معافی مانگی پھر اطمینان سے بٹھا کر ان سے سردار مدینہ کے بارے میں مختلف سوالات کیے، ہر سوال کے جواب میں وہ حیران ہوتے۔ سردار کے حسن سلوک اور اخلاق کے بارے میں سن کر ان کا دل بھی اس نیک ہستی کی طرف کھنچا چلا جاتا اور اپنے اس طرح بھاگ کر آ جانے پر افسوس ہوتا آخر کار دل میں سردار مدینہ سے ملاقات کی خواہش لیے وہ مدینہ جا پہنچے، جہاں پر اس نیک دل سردار سے مل کر انھیں بہت خوشی ہوئی اور وہ فوراً مسلمان ہو گئے۔

کل تک جو اس نئے دین سے بھاگ رہے تھے، آج انہی سردار اور دین اسلام کی محبت میں دل و جان سے راضی اور خوش تھے۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں دوبارہ قبیلہ 'طے' کا سردار بنا دیا اور وہ ایک بار پھر پہلے سے بھی بڑھ کر لوگوں کی مدد کرنے اور جھولیاں بھر بھر کر دینے لگے لیکن اب یہ مدد اور سخاوت ان کے والد کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تھی۔

پھول ہی پھول

کولمبیا کے شہر میڈیلین میں رنگ برنگے پھولوں سے بنے فن پاروں کی دلچسپ پریڈ کا انعقاد کیا گیا۔ اس سالانہ پریڈ میں پھولوں سے تیار کردہ منفرد فن پاروں اور گلدستوں کو نمائش کے لیے پیش کیا گیا۔ اس فلاور پریڈ میں ہر فن پارے کی تیاری میں ایک سے زائد رنگوں اور اقسام کے پھولوں کو استعمال کیا گیا جنھیں لوگوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا کر مارچ کیا۔ پھولوں سے دلچسپی رکھنے والے لاتعداد افراد نے اس پریڈ میں شرکت کی اور پھولوں کی اس دلچسپ پریڈ سے محظوظ ہوئے۔

ساتھی کے قلمکاروں کے اعزاز میں ایک بار پھر

ماہنامہ ساتھی کراچی کی جانب سے

ایک شاندار تقریب ایک پر رونق محفل

ساتھی رائٹرز ایوارڈ ۲۰۱۵ء

نومبر ۲۰۱۵ء

جس میں دیئے جائیں گے ایوارڈز، ان ادیبوں اور قلم کاروں کو جن کی تحریریں سال ۲۰۱۳ء اور ۲۰۱۴ء کے دوران ساتھی کی زینت بنتی رہی ہیں

عالم اسلام کی شاہکار مساجد

سلیمیہ مسجد

سلیمیہ مسجد ترکی کے شہر ادرنہ میں واقع ہے۔ یہ مسجد عثمانی سلطان سلیم دوم کے حکم پر تعمیر کی گئی اور اسے مشہور معمار سنان پاشا نے ۱۵۶۸ء سے ۱۵۷۴ء کے درمیان تعمیر کیا۔ اسے سنان پاشا کے فن کا عظیم ترین شاہکار اور اسلامی طرز تعمیر کا شاندار نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اس میں ایک تاریخی شفاخانہ بھی واقع ہے جسے اب عجائب گھر بنا دیا گیا ہے۔ سنان نے مسجد کا طرز تعمیر ایسا رکھا کہ مسجد کے ہر کونے سے محراب صاف دکھائی دے۔ اس مسجد میں روایتی عثمانی طرز تعمیر کے حامل چار خوبصورت مینار بھی شامل ہیں جبکہ ایک عظیم گنبد اس پر موجود ہے۔ مسجد کے گرد کتب خانے، مدرسہ، حمام، لنگر خانہ، بازار، شفاخانہ کے علاوہ ایک قبرستان بھی قائم کیا گیا تھا۔ ۱۹۱۵ء میں بلغاریہ کی جانب سے ادرنہ کے محاصرے کے موقع پر مسجد کا گنبد بلغاری توپ خانے کی زد میں آ گیا لیکن مضبوط تعمیر کے باعث صرف اس کی بیرونی تہہ کو ہی نقصان پہنچا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک کے حکم پر اس نقصان کو درست نہیں کیا گیا۔ ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۵ء تک مسجد کی تصویر ترکی کے ۱۰ ہزار لیرا کے نوٹ پر بھی آویزاں تھی۔

جہیز کی بطخ

صفائی کے دوران گھر میں ہونے والی
نوک جھونک نے
ایک دلچسپ صورت حال
پیدا کردی

''ارے یہ میرے جہیز کی بطخ کس نے باہر نکال کر رکھ دی؟'' امی نے برآمدے کے کونے میں سامان کے ڈھیر کا جائزہ لیتے ہوئے زبردست چیخ کے ساتھ دل تھاما۔ وہ ابھی ابھی کچن سے نکلی تھیں۔

''ہائیں! جہیز کی بطخ؟ تو گویا پورا چڑیا گھر ہی ساتھ لائیں تھیں محترمہ اپنے جہیز میں۔'' کونے میں پڑی کرسی پر اخبار پڑھتے ابو نے بھی بوکھلا کر کہا۔

''جی نہیں چڑیا گھر جہیز میں لانے کی ضرورت کیا تھی؟ جب سسرال والے خود کفیل تھے اس معاملے میں۔'' امی نے سر جھٹکا پھر بولیں: ''میں تو جہیز کے اس پاندان کی بات کر رہی ہوں جو بطخ کی شکل کا ہے اور خالص لوہے کا ہے۔''

ابو اخبار ایک طرف ڈال کر اُٹھے اور قد آدم پاندان کا چشمے کے پیچھے سے تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے گویا ہوئے: ''بہت خوب تو انسانی قد کے برابر اس پاندان کے اندر بیٹھ کر پان لگانے اور کھانے ہوں گے۔''

ابو کی بات سن کر امی بُرا مان کر بولیں: ''حد ہوگئی میں کہتی ہوں اپنے لاڈلوں کو بلائیں جنھوں نے گھر کی ساری چیزیں یہاں برآمدے میں لاکر ڈھیر کردی ہیں..... ارے یہ دیکھیں آپ کا سو سال پرانا بریف کیس۔'' امی نے سامان کے ڈھیر سے ایک بدرنگ اور ٹوٹا ہوا بریف کیس نکالا۔

''ارے کمال کر دیا بچوں نے یہ کہاں سے ڈھونڈ نکالا؟ میرا پہلا یادگار بریف کیس اس میں قیمتی چیزیں اور کاغذات رکھا کرتا تھا۔ یہ سو سال نہیں صرف تیس سال پرانا ہے۔'' ابو نے لپک کر بریف کیس اٹھالیا۔

''اب اس میں کوئی قیمتی اور یادگار چیز بند نہیں کیوں کہ اب خود یہ بریف کیس ہی بند نہیں ہوتا۔ منھ کھلا رہتا ہے اس کا۔'' امی نے تنک کر کہا۔

''ہاں ہمارے گھر کی اکثر چیزوں کا منھ کھلا ہی رہتا ہے۔'' ابو حسرت بھری آہ بھر کر کن انکھیوں سے امی کو دیکھتے ہوئے بولے۔ پھر بچوں کو آواز دی۔

''احد، انس، مومنہ۔'' ابو کی آواز پر تینوں بچے بھاگے آئے۔

''کیا ہو رہا ہے یہ سب کچھ؟ یہ گھر کا سارا سامان یہاں نکال کے کس خوشی میں ڈھیر کیا ہے؟'' ابو کڑک دار آواز میں بولے۔

''جی ابو وہ ہم نے سوچا گھر میں سامان بہت زیادہ جمع ہوگیا ہے۔ ہم نے سوچا ضرورت سے زائد سامان الگ کرلیں، ہمیں اگلے ہفتے اسکول والے ایک یتیم خانے لے جارہے ہیں۔ ٹیچرز نے کہا کہ پیسے اور گھریلو استعمال کی صحیح حالت کی چیزیں جمع کر کے لائیں۔ ہم نے سوچا اچھا ہے اس بہانے گھر کی صفائی بھی ہوجائے گی اور جو چیزیں ہم استعمال نہیں کرتے کسی اور کی ضرورت پوری کرنے کے کام آجائیں گی۔ صفائی کے دوران بالکل ہی بے کار چیزیں گھر سے باہر پھینک دیں تو گھر بھی صاف ستھرا ہوجائے گا۔'' احد نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''ارے حد ہوگئی بھلا میرے جہیز کی بطخ کیا کام آئے گی کسی کے؟'' امی غصے سے بولیں۔

''تو یہ ہمارے بھی کیا کام آرہی ہے؟ اگر ہم اسے نکال دیں تو کافی جگہ بن جائے گی کچھ اور رکھنے کے لیے۔'' انس آہستہ آواز میں بولا۔

''اور یہ میرا بریف کیس؟ خبردار جو اسے پھینکا یہ میری پہلی نوکری کی یادگار ہے۔ پھینکنا ہی ہے تو اپنا فالتو سامان پھینکو اور یتیم خانے کے پیسے مجھ سے لے لو۔'' ابو نے غصے سے جیب ٹٹولی۔

''ہاں بھئی یتیم خانے کو دینا تو ثواب کا کام ہے۔ اس سے تو ہم منع نہیں کریں گے۔ میرے خیال میں سو روپے مناسب ہوں گے۔'' امی جلدی سے بولیں۔

ابو نے کتھے میں لتھڑا سو کا نوٹ احد کے حوالے کیا۔

''لیکن ابو ہم گھر کی صفائی بھی تو کرنا چاہتے ہیں۔

دیکھیں ناں گھر میں صرف دو کمرے اور ایک اسٹور ہے۔ ہم سب ایک دوسرے کے اوپر چڑھ چڑھ کر چلتے پھرتے ہیں۔ اگر سامان کم ہو جائے تو.....''

مومنہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کیا مطلب؟ سامان، ارے یہ میرے ایکسرے، سن انیس سو پچھتر (۱۹۷۵ء) میں کرائے تھے اور تم نے اس طرح پھینک دیئے۔ کتنا خوفناک حادثہ تھا تم لوگ تو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔'' ابو نے جھک کر ایکسرے شیٹ اٹھائی۔

''مگر ابو اب تو آپ کی ہڈیاں جڑ چکی ہیں اب اس خوفناک حادثے کی یادگار اس ایکسرے رپورٹ کو رکھنا بیکار ہے۔'' انس معصومیت سے بولا۔

''اور یہ کمبل؟ خالہ فریدہ نے دیا تھا وہ بھی اتنی محبت سے اور تم لوگ یہ کمبل پھینک رہے ہو؟'' امی نے سامان سے ایک کمبل اٹھاتے ہوئے کہا۔

''امی اب تو ان کی اس محبت کی یادگار کو چوہے کتر گئے ہیں۔ خود اس کمبل کا رنگ بھی چوہے جیسا ہو گیا۔ کوئی استعمال بھی نہیں کرتا سوائے گھر کے چوہوں کے۔ اگر ہم اسے پھینک دیں تو.....'' انس دبی آواز میں بولا۔

''بھئی کچھ بھی ہو میں یہ تار، پرانا ٹیلی فون سیٹ اور رسیوں کے ٹوٹے ٹکڑے تو پھینکنے نہیں دے سکتا، یہ سب بڑے کام کی چیزیں ہیں۔'' ابو سامان کا جائزہ لیتے ہوئے حتمی لہجے میں بولے۔

''رسیوں کے ٹکڑے اتنی بار کام آ چکے ہیں کہ اب مزید کسی کام نہیں آ سکتے۔'' احد بولا۔

''ارے میں کہتی ہوں پھینکنا ہی ہے، ردی میں بیچنا ہی ہے تو اپنی چیزیں بیچو کیوں احد کے ابا؟'' امی غصے سے بولی۔

''ہاں ہاں تم لوگوں نے کیا کم کاٹھ کباڑ جمع کیا ہے؟ ابو جوش میں بچوں کے کمرے کی طرف بڑھے۔ امی بھی ان کے پیچھے چلی گئیں۔

''ارے ابو! یہ کیا؟ میری ایکسرسائز مشین کیوں باہر نکال لائے؟'' انس بوکھلا اُٹھا۔

''بیٹا! اس لیے کہ اس کمرے میں سب سے زیادہ جگہ اس مشین نے گھیری ہوئی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس ایکسرسائز مشین پر برخوردار آپ کو کبھی ایکسرسائز کرتے ہوئے تو دیکھا نہیں۔ ہاں اس پر میلے کپڑے تو لیے اور اخبار ضرور دیکھے ہیں۔ ویسے بھی وزن صرف کمرے میں ایکسرسائز مشین رکھ لینے سے کم نہیں ہو جاتا۔'' ابو طنزیہ آواز میں بولے۔

''اور یہ بھی لو۔'' امی نے وزن کرنے والی مشین لا کر برآمدے میں پٹخی۔ ''ایک محترم ایکسرسائز کرتے ہیں اور دوسری محترمہ وزن کرنے والی مشین پر سوار رہتی ہیں۔ وہ بھی اس شکایت کے ساتھ کہ یہ خراب ہو چکی ہے۔ وزن ہمیشہ زیادہ بتاتی ہے۔'' امی نے مومنہ کو طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں مگر کبھی کبھی صحیح وزن بھی بتاتی ہے۔ اگر اس پر بتائے وزن میں سے ۵ کلو مائنس کر دیئے جائیں۔'' مومنہ جلدی سے بولی۔

''اور یہ پرانے کپڑے، ان قمیصوں میں اب تم کبھی نہیں گھس سکتی سن لو! پھر الماری میں سنبھال کر رکھنے کا فائدہ؟'' امی نے کپڑے مومنہ کی طرف بڑھائے۔

''میں کسی بھی وقت دبلی ہو سکتی ہوں اور یہ قمیصیں میرے کام آ سکتی ہیں۔'' مومنہ نے وضاحت دی۔

''اور یہ پرانے موبائلوں کے ڈبے؟ جو موبائل چوروں کے پاس پہنچ چکے ہیں ان کے ڈبے تم کیوں سنبھالے بیٹھے ہو؟'' ابو غرائے۔

''تو کیا چور کا ایڈریس معلوم کر کے یہ ڈبے اور وارنٹی کارڈ بھی چور کو پہنچا آؤں؟'' احد نے سر کھجایا۔

''آپ موبائل کے ڈبوں کو رو رہے ہیں، یہ دیکھئے۔ چھتیس (۳۶) نمبر کے جوتوں کے چھتیس خالی ڈبے آپ کی لاڈلی سمجھتی ہے کہ خالی ڈبوں کو سنبھال کر رکھا جائے تو رکھے رکھے ان ڈبوں میں نئے جوتے اُگ آتے ہیں۔'' امی نے جوتوں کے خالی ڈبوں کا ڈھیر لا کر برآمدے میں پٹخا۔

''امی اگر کسی جوتے کا ڈبہ ٹوٹ جائے تو ایکسٹرا ڈبے میں وہ جوتا رکھ کر محفوظ کیا جا سکتا ہے۔'' مومنہ نے مری مری آواز میں کہا۔

''ڈبے کیوں ٹوٹیں، تمہارے تو صرف جوتے ٹوٹتے ہیں۔ آج کل ڈبے اعلا کوالٹی کے اور جوتے گھٹیا بن رہے ہیں کیوں؟ صحیح کہا ناں؟'' امی نے طنزیہ نظروں سے مومنہ کو گھورا۔

''حد ہو گئی یہ بچپن کے چشمے بھی جمع ہیں کیا تم لوگ سمجھتے ہو کہ کبھی دوبارہ چھوٹے ہو گے اور یہ چشمے اپنی ناک پر فٹ کر سکو گے؟'' ابو نے چشموں کے دو تین سیٹ لا کر سامان کے ڈھیر میں ڈالے۔

ابھی یہ بحث جاری تھی اور کتنے ہی عرصے جاری رہنی تھی کہ گھنٹی بجی۔ احد لپک کر باہر گیا واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بند لفافہ تھا۔

''ابو یہ خط آپ کے نام۔'' ابو نے چشمہ ناک پر جماتے ہوئے لفافے میں سے خط نکالا اور اسے پڑھتے ہی سر پر ہاتھ مار کر بولے: ''لو بھئی تمہارے خالو جان آ رہے ہیں تین دن کے لیے اب انھیں کہاں ٹھہرایا جائے گا؟''

امی خوش ہو کر بولیں: ''بھائی جان آ رہے ہیں یہ تو اچھی خبر ہے۔''

''بھئی لوگ سمجھتے بوجھتے تو ہیں نہیں ہمارا گھر تنگ ہے، پانچ لوگوں کے لیے ہی چھوٹا پڑتا ہے۔ یہاں مہمان ٹھہرانے کی گنجائش کہاں؟'' ابو نے امی نے گھورتے ہوئے کہا۔ امی خفا ہو گئیں۔

''ان بے چارے کو کیا پتا کہ اس گھر میں کاٹھ کباڑ کی جگہ تو ہے کسی مہمان کی نہیں۔'' ابو چڑ کر بولے۔

"تو پھر اس ڈبیا جیسے گھر میں مہمان فٹ کرنے کی کوشش کریں۔" بچوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا، احد آگے بڑھ کر بولا: "امی ابو اگر گھر کا سارا کاٹھ کباڑ کم ہوجائے تو اسٹور میں ایک فولڈنگ پلنگ کی گنجائش نکل آئے گی میں اور انس تین دن تک اس پر سو سکتے ہیں۔"

مومنہ نے ماں کو دیکھا اور بولی: "امی اگر آپ کے تاریخی سامان میں سے کچھ چیزیں نکال دی جائیں تو کمرے میں ایک عدد فرشی بستر کی جگہ نکل آئے گی جہاں میں سو سکتی ہوں تین دن تک۔"

انس بولا: "بالکل ٹھیک اس طرح وہ کمرہ جس میں ہم بہن بھائی آج کل رہتے ہیں وہ خالو جان کو دیا جاسکتا ہے۔ بات امی کی بہن کے شوہر کی تھی۔ ایک طرف ناک کا سوال تھا دوسری طرف تاریخی سامان۔

امی کشمکش میں ڈوبی رہیں پھر بولی: "بھئی بچے صحیح کہتے ہیں کچھ سامان تو واقعی بالکل ہی بے کار ہے۔ نکال ہی دینا چاہیے۔ اب بھلا گھر میں کوئی پان کھانے والا ہی نہیں تو یہ اونچی لمبی لوہے کی بطخ نما پاندان رکھ کر کیا کرنا؟" امی نے بطخ کی شکل کا پاندان پاؤں سے کنارے کردیا۔ بچے معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے اور پھر کمروں سے مزید سامان نکال لانے کے لیے مڑ گئے۔ ابھی انھیں تین بہت اہم کام کرنے تھے۔ مزید سامان اکٹھا کرکے ردی والے کے حوالے کرنا، حاصل شدہ رقم کو یتیم خانے کے فنڈ میں دینا اور ہاں خط لکھنے پر خالو جان کا شکریہ ادا کرنا۔

☆.....☆

بلی اور ہم

میرے گھر میں کچھ روز پہلے ایک بلی نے بچے دیے۔ مجھے بلی کے بچے بہت پسند ہیں۔ میں ان کو پیار کرنا چاہتا تھا لیکن بلی مجھے ان کے قریب بھی نہیں آنے دیتی تھی۔ بلکہ اگر میں ان بچوں کی طرف تھوڑا بھی بڑھتا تھا تو وہ غرانے لگتی تھی۔ پرسوں میں نے دیکھا کہ بلی اِدھر اُدھر ٹہل رہی ہے وہ بھوکی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے دودھ دیا۔ وہ ابھی بھی مجھ سے ڈر رہی تھی۔ بڑی دیر بعد بھوک سے مجبور ہوکر میرے قریب آئی اور دودھ پینے لگی۔ اسی دن رات کو میں نے اسے پھر دودھ دیا۔ اگلے دن صبح جب میں دروازے کے قریب آیا تو بلی اپنے بچوں کو لیکر آئی اور میرے قدموں میں لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ میرا ذہن جکڑ کر رہ گیا۔ میں نے صرف دو دفعہ اس بلی کو دودھ پینے کے لیے دیا تو میری اتنی ممنون و مشکور ہوگئی کہ میرے قدموں میں لوٹنے لگی.....

میرا اللہ!..... میرا اللہ مجھے اتنے سال سے کھلا رہا ہے، پلا رہا ہے، سُلا رہا ہے، دنیا کی ہر نعمت سے مجھے نوازا ہے۔ آنکھوں کی نعمت، بولنے کی نعمت، سُننے کی نعمت، چلنے پھرنے کی نعمت..... سورج کی روشنی سے ہم نفع اُٹھائیں، چاند کی ٹھنڈک ہمارے لیے اور ہوا اور پانی کی نعمتیں ہمارے لیے اور کیا کیا اپنے رب کی عنایتوں کے بارے میں لکھیں..... پھر ہم کیوں اس کے در پر جاکر اس کے ممنون و مشکور نہیں بن جاتے؟ (مرسلہ: انجم خان، چترال)

ایک جھوٹی کہانی

وقار محسن

"کیا کہا؟ ہاتھی کے انڈے میں سے اونٹ کا بچہ"
رحلت سے قبل لکھی گئی مصنف کی ایک دلچسپ کہانی

نا جانے نانو (نانی) کی اکثر کہانیوں میں بادشاہ احمق اور وزیر زیرک کیوں ہوتا تھا۔ ممکن ہے کیونکہ بادشاہ سلامت اکثر قلعے، مینار، مقبرے بنوانے، شکار کھیلنے اور خوشامدی درباریوں میں گھرے رہتے تھے۔ اس لیے سلطنت کے تمام کاروبار غریب وزیر کے کاندھے پر رہتے ہوں گے۔ یہ کہانی ایک ایسے ہی احمق بادشاہ کی ہے۔ بادشاہ کو خبر ملی کہ اس کی سلطنت میں ایک ایسا داستان گو ہے جو ہر بار نئی اور سچی کہانی سناتا ہے اور اکثر کہانی اتنی طویل ہوتی ہے کہ کہانی سننے والا تنگ آجاتا ہے۔

بادشاہ نے داستان گو کو بلا کر کہا۔

''میاں! تمھاری داستان گوئی کے بڑے چرچے سنے ہیں۔ سنا ہے تمھاری ہر کہانی سچی ہوتی ہے اور بہت طویل ہوتی ہے لیکن مجھے تم ایسی کہانی سناؤ جو بالکل جھوٹی ہو اور مختصر بھی ہو۔ اگر اس کہانی میں ایک بات بھی سچی ہوئی تو آپ کا تربوز جیسا سر مع پگڑی کے تن سے جدا کر دیا جائے گا۔''

داستان گو نے فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔

''سرکار میں کوشش کروں گا کہ اس کہانی میں کوئی جملہ سچ نہ ہو۔ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ اگر کہیں میں آپ کی شان میں گستاخی کروں تو آپ سمجھیں کہ میں تعریف کر رہا ہوں کیونکہ مجھے سچ سے قطعی پرہیز کرنا ہے۔'' بات معقول تھی اس لیے بادشاہ راضی ہوگئے اور داستان گو نے کہانی شروع کی۔

''حضور یہ دو ہزار سال پہلے کی میری آپ بیتی ہے جب قبلہ والد صاحب نے گھٹنوں چلنا سیکھا تھا اور میں ان کو اکثر میلا دکھانے اپنے کاندھے پر بٹھا کر لے جاتا تھا۔ ایک بار ہم قریبی گاؤں کے میلے میں گئے جہاں فٹ بال کے برابر ہاتھی کے انڈوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔''

''کیا کہا؟ ہاتھی کا انڈا؟ اچھا..... اچھا..... آگے چلو'' بادشاہ کو یاد آیا کہانی جھوٹی ہونا ہے۔

''تو حضور! ابا تو مچل گئے ہاتھی کا انڈا لینے کے لیے۔ میں نے انڈا خریدا اور ایک کندھے پر والد بزرگوار اور دوسرے پر دس کلو کا انڈا رکھ کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں کیچڑ تھی۔ میرا پیر پھسلا اور انڈا اور ابا دور جا گرے۔ انڈا دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور اس میں سے ایک اونٹ کے بچے نے نکل کر مجھے سلام کیا۔''

''کیا کہا؟ ہاتھی کے انڈے میں سے اونٹ کا بچہ۔'' بادشاہ نے غصے سے کہا۔

''جی ہاں! اور کیا ہاتھی کے انڈے میں سے بلی کا بچہ نکلتا۔ اچھا تو آگے سنئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اونٹ کا بچہ پورے اونٹ کے برابر اونچا ہوگیا اور میں اور ابا اس کی دم پر سوار ہوگئے۔ سامنے سے مرغی کا ایک شریر چوزہ آرہا تھا۔ اس نے اونٹ سے کہا 'اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔' اتنا سنتے ہی اونٹ کو غصہ آیا اور وہ چوزے سے بھڑ گیا۔ چوزے نے اونٹ کو سر سے اوپر اٹھا کر ایسا پٹخا کہ میں اور ابا اچھل کر آم کے درخت پر جا بیٹھے جس پر بڑے بڑے تربوز لٹک رہے تھے۔''

''ارے! آم کے پیڑ پر تربوز؟ کیا تم نے ہمیں گدھا سمجھا ہے۔'' بادشاہ چیخا۔

''جی حضور! آپ اعلا نسل کے گدھے ہیں۔'' داستان گو نے اطمینان سے کہا۔ پہلے تو بادشاہ نے تلوار سونت لی پھر خیال آیا کہ داستان گو نے ہر بات

جھوٹ کہنی ہے۔ دراصل وہ بادشاہ کو عقل مند کہنا چاہ رہا ہے۔ داستان گو نے کہانی جاری رکھی۔

''تو سرکار! پھر ہوا یوں کہ چوزے نے مار مار کر اونٹ کا بھرکس نکال دیا۔ کچھ دیر بعد جب اُونٹ کو ہوش آیا تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شریر چوزہ چلا گیا یا نہیں۔ اونٹ وہاں سے بھاگا اور ایک لوٹے میں گھس گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ لوٹے کی ٹونٹی سے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پورا اونٹ تو نکل گیا لیکن اس کی دم پھنس گئی اور اس کی دُم سوالیہ نشان (؟) کی طرح کھڑی ہوگئی۔ اونٹ لوہار کے پاس گیا اور اس کی خوشامد کی کہ اسے لوٹے سے نجات دلائے۔ لوہار نے لوٹے پر زور سے ہتھوڑا مارا۔ لوٹے کے دو ٹکڑے ہوگئے اور اس میں سے اونٹ کے ساتھ ایک ببر شیر بھی نمودار ہوا جو لوٹے میں پہلے سے چھپا بیٹھا تھا۔''

''ارے لوٹے میں سے ببر شیر؟ کیا ہم خبطی ہیں؟'' بادشاہ نے اپنے بال نوچتے ہوئے کہا۔

''یقیناً! حضور خبطیوں کے بادشاہ ہیں۔ یعنی میرے کہنے کا مطلب تو حضور سمجھ ہی گئے ہوں گے..... وہی جھوٹ والی بات۔''

بادشاہ نے پھر کچھ سوچ کر تلوار میان میں رکھ لی۔

''ہاں تو سرکار! شیر بہت بھوکا تھا۔ پہلے تو اس نے لوہار کے گدھے کی ساری گھاس ہڑپ کر لی پھر پانی پینے کے لیے تالاب میں گھس گیا۔ شیر کو دیکھتے ہی ساری مچھلیاں ڈر کے مارے تالاب کے کنارے واقع ببول کے درخت پر چڑھ گئیں۔''

''ارے جھوٹے! حد کر دی۔ یعنی مچھلیاں درخت پر چڑھ گئیں۔'' اب بادشاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ داستان گو کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ اگر اب اس نے مزید کہانی جاری رکھی تو بادشاہ صاحب برداشت نہیں کر پائیں گے۔ اس لیے اس نے کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔

''میں اور ابا سامنے آم کے درخت کی شاخ پر بیٹھے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ اب کیوں کہ شام ہوگئی تھی اور سورج مشرق میں ڈوب رہا تھا، اس لیے ہم دونوں گھر واپس آگئے۔''

بادشاہ نے کہانی کے اختتام پر سکون کا سانس لیا اور رازدانہ انداز میں پوچھا۔

''اچھا سچ سچ بتا دو کہ یہ کہانی سچی ہے یا جھوٹی۔''

''حضور! یہ کہانی لفظ بالفظ سچی ہے۔'' داستان گو نے کہا۔

'پھر تو تم شرط ہار گئے۔'' بادشاہ سلامت چہکے۔

''سرکار! اس کہانی کو سچا کہنے سے بڑا جھوٹ کیا ہو سکتا ہے۔'' داستان گو نے اطمینان سے کہا۔

بادشاہ نے داستان گو کی ذہانت سے خوش ہو کر اسے قیمتی انعامات سے نواز کر رخصت کیا۔

☆.....☆

ذِہن لڑاؤ۔ انعام پاؤ

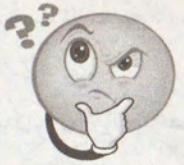

سلسلہ نمبر ۱۶

ساتھیو! آپ کے لیے لائے ہیں ایک انوکھا..... ذہن کے جنگی سپاہیوں کو جگانے کے لیے..... مزیدار کھیل..... گتھیاں سلجھائیں..... پہیلیاں بوجھیں اور حاصل کریں **اکیڈمی بک سینٹر** کی طرف سے ڈھیر ساری کتابیں..... تو پھر دیر کس بات کی..... نیچے دیئے گئے سوالوں کے جوابات دیں اور ثابت کریں کہ آپ کر سکتے ہیں کچھ نیا اور انوکھا۔

کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ یہی ناں..... کہ ان چہروں سے ذہن کو کیوں کر لڑایا جائے، یہ تو خود بے چارے حیران و پریشان نظر آرہے ہیں۔ ارے بھئی..... ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں کہ کسی کو لڑانے کے بجائے آپ ان چہروں پر لکھے احساسات کو پڑھیں اور.....؟ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے.....؟ آپ جو پڑھیں اسے کسی کاغذ پر لکھ کر ساتھی کے پتے پر ارسال کر دیں۔ خیال رہے لکھے گئے الفاظ اردو میں ہوں۔

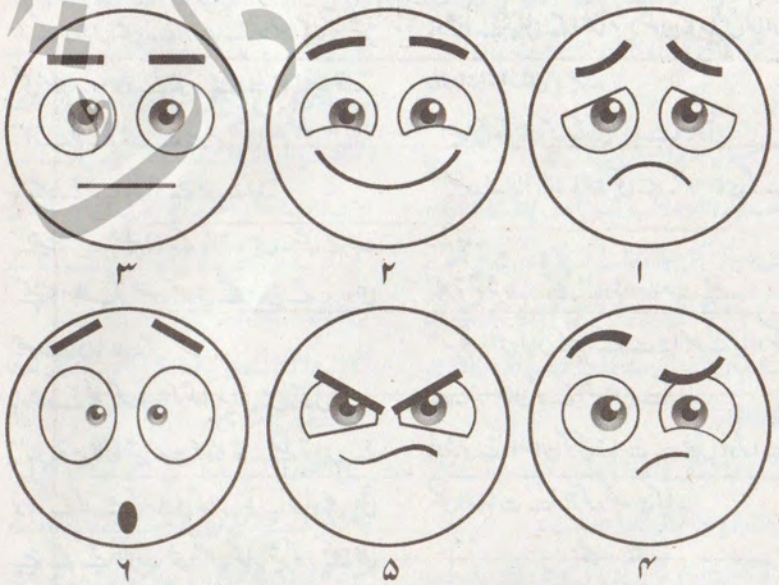

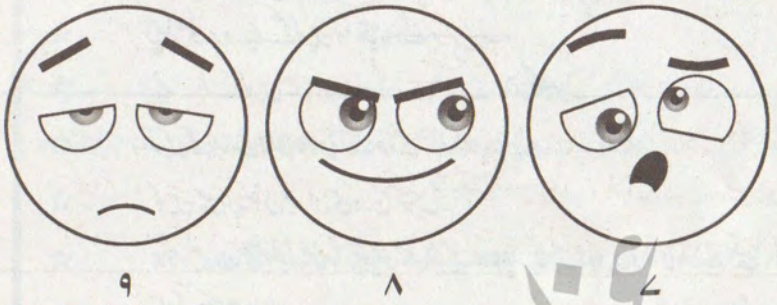

کوپن ذِہن لڑاؤ۔ انعام پاؤ.....(۱۶)

نام _____

کلاس _____ فون _____

پتا _____

_____

_____

_____ ای میل _____

ہدایات

☆..... پچھلے صفحہ پر دیئے گے کوپن کو احتیاط سے پر کریں۔

☆..... نیچے دیئے گے کوپن میں جوابات درست نمبر کے ساتھ لکھیں۔

☆..... کوپن کو ہر ماہ کی 30 تاریخ تک ساتھی کے مندرجہ ذیل پتے پر روانہ کریں۔

☆..... کوپن میں اپنا فون نمبر لازمی درج کریں۔

☆..... جو قارئین انعامی سلسلہ میں بذریعہ ای میل شریک ہونا چاہتے ہیں وہ کوپن کو اسکین کر کے ہمیں روانہ کر سکتے ہیں

پتا : F-206 سلیم ایونیو، بلاک 13-B گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 021-4976468

ای میل: monthlysathee@hotmail.com

جوابات

۱ _____	۶ _____
۲ _____	۷ _____
۳ _____	۸ _____
۴ _____	۹ _____
۵ _____	

ذِھن لڑاؤ۔ انعام پاؤ

سلسلہ نمبر ۱۴

ہم نے ماہ جولائی میں قارئین کو کچھ الفاظ دیے تھے جن کے بہت سے قارئین نے خوبصورت جملے بنا کر بھیجے۔ ہم نے بہترین جملے بنانے والوں میں سے پانچ انعام یافتگان بذریعہ قرعہ اندازی چُنے ہیں جن کے نام ذیل میں درج ہیں۔

بذریعہ قرعہ اندازی درست جوابات دینے والے پانچ انعام یافتگان:

۱۔ لائبہ شہزاد (کراچی)

۲۔ محمد ذیشان (کراچی)

۳۔ ناہید ضمیر کھوسہ (کراچی)

۴۔ انس شاہنواز (لاہور)

۵۔ محمد احمد نور محمد فیصل (کراچی)

ان ساتھیوں نے بھی اچھی کوشش کی:

حافظ محمد عبداللہ جاوید اقبال (کراچی)، عمار اقبال (شارجہ)، ماہ رُخ (حیدر آباد)، اطہر نفیس (حیدر آباد)، محمد عمر رشید (کراچی)، عریشہ بنت نوید حسنات (کراچی)، ماریہ خان (جدہ)، عمار وسیم (فیصل آباد)، کریم اللہ (پشاور)، حنظلہ نعمان (لاہور)، عبدالوہاب (کراچی)، سحر حسن (کراچی)، فرحت سلطان (کراچی)، سعد شاہ (میر پور خاص)، احمد شیخ (اسلام آباد)، معاذ صبور (کراچی)، ثروت نعیم (کراچی)، فیصل شبیہ (کراچی)، اشعر عثمان (لاہور)، زبیر شہزاد (لاہور)، اسماء مہر (کراچی)، عثمان منصور (کراچی)، ابرار کشمیری (راولپنڈی)، عبدالباسط کانجو (جعفر آباد)، اعظم خان (پشاور)، ذکی احمد (ریاض)، خدیجہ صلاح الدین (گھوٹکی)، خالد عثمان (کراچی)، حسان خالد (کراچی)، شعیب خلیق (کراچی)، وفا اقبال (شارجہ)، احسن افضال (کراچی)، زہرہ کمال (کراچی)، کرن ناز (جدہ)، سراج الدین (سکھر)، احسن خاور (کراچی)، علی معین (کراچی)، طٰہٰ معیز (چکوال)، عائشہ فیصل (میر پور خاص)، شبیہ الفاطمہ (لاہور)، انور ظہیر (کراچی)، حافظ عزیر (کراچی)، اویس خالد (کراچی)، ہارون راجپوت (لاڑکانہ)، عظیم مجاہد (کراچی)، منیبہ کمال (کراچی)، زہرہ افضال (جدہ)، فرخ افضال (جدہ)، حمزہ نسیم (کراچی)، جمشید حیدر (اسلام

آباد)، صائمہ سراج (کراچی)، عبدالحمید (ساہیوال)، نوید عباس (ملتان)، رابعہ اکرم (کراچی)، محبوب آغا (کراچی)، سیما سراج (کراچی)، حذیفہ خاور (کراچی)، عمار نعیم (ملتان)، جنید بشیر (نصیر آباد)، احسن عباس (کراچی)، زین العابدین (بلوچستان)، اشتیاق احمد (ڈیرہ مراد جمالی)، برکت مگسی (کراچی)، تنویر تنولی (سعودی عرب)، انعم خان (کراچی)، ثناءاللہ (بلوچستان)، نورحسین (ڈیرہ مراد جمالی)، سیدہ مدحت (کراچی)، سکینہ چوہدری (گجرانوالہ)، عبدالحسیب (نصیر آباد)، بابر علی (بلوچستان)، عبداللہ حذیفہ (کراچی)، محمد طارق (ڈیرہ مراد جمالی)، محمد شاہد (کراچی)، مصیب صدیق (نصیر آباد)، کاشف علی (بلوچستان)، علی محمد بلوچ (بلوچستان)، حضور بخش (نصیر آباد)، محمد اسماعیل (ڈیرہ مراد جمالی)، غلام سرور (نصیر آباد)، عائشہ صدیقہ (کراچی)، خالد خان (نصیر آباد)، شفیع محمد (بلوچستان)، باسط محمد عمران (کراچی)، حمنہ اصغر (گھوٹکی)، سلیم رضا (بلوچستان)، عبدالکریم (ڈیرہ مراد جمالی)، اصغر علی (بلوچستان)، معظم احمد خان (کراچی)، توقیر احمد (نصیر آباد)، حافظ محمد اکرام (کراچی)، ظفر اللہ (بلوچستان)، ثاقب عارف (کراچی)، محمد ابراہیم (نصیر آباد)، صالح محمد (نصیر آباد)، محمد یونس (کراچی)، مشتاق احمد (بلوچستان)، عمر علی خان (کراچی)، عباد الرحمٰن (کراچی)، محمد سراج الحق (بلوچستان)، وہاج احمد (کراچی)، غلام سرور (بلوچستان)، ظہیر شریف (بلوچستان)، اقراء صدیقی (سیالکوٹ)، عامر شہزاد (بلوچستان)، اقبال محمود (کراچی)، حمزہ اسلام (کراچی)، منور حسین ساجد (راولپنڈی)، محمد الیاس قاضی (کراچی)، ثوبیہ کوثر (سکھر)، نور محمد (کراچی)، حمیرہ ایوب (لاڑکانہ)، پاکیزہ حسین (حیدر آباد)، سعدیہ مدثر (کراچی)، زبیر رشید (کراچی)، طارق مبین (بہاولپور)، جمیل احمد (پشاور)، علی احمد خان (کراچی)، سلمان ظہیر (کراچی)، سارہ ظہیر (کراچی)، شاہ زیب حسن (کراچی)، سعدیہ عادل (کراچی)، گل حسن سیرائی (نصیر آباد)، انس امین (کراچی)، خالد خان (نصیر آباد)، احسن عبدالقادر (کراچی)، آمنہ شاہد (کراچی)، طلحہ عبدالقادر (کراچی)، زیب علی محمد اسماعیل (کراچی)، عبدالباسط (کراچی)، خالدہ مسعود (لاہور)، علی انوار (کراچی)، اختر حسین سومرو (بلوچستان)، حفصہ بنت نیر (کراچی)، شاہ زیب شفیق (کراچی)، زاہد حسین خان (حیدر آباد)، ثمینہ انجم (بلوچستان)، احسان اللہ ابڑو (نصیر آباد)، علی محمد خالد (کراچی)، عاصم نذیر (بلوچستان)۔

بتعاون
اکیڈمی بک سینٹر
ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔فون:۳۶۸۰۹۲۰۱(۲۱۔۹۲)
برقی پتا:irak.pk@gmail.com، ویب گاہ:www.irak.pk

کارنامہ

زبیر فرید

"موٹو بھائی! ترکیب تو خوب بتلائی، اب یہ بتاو کہ اسے عملی پاجامہ کب پہنانا ہے"

''یار! کوئی ایسا کارنامہ انجام دینا چاہیے جس سے سارا اسکول ہمارے گن گانے لگے۔'' بن کباب کھاتا موٹو میری ران پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

میں نے اپنی ران سہلاتے ہوئے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، پھر کہا: ''تم بھول رہے ہو، یہ میری ران ہے، کارنامے کا میدان نہیں۔''

یہ سن کر موٹو نے قہقہہ لگایا اور دوبارہ کھانے میں مصروف ہوگیا۔ ہم پانچ دوستوں کا گروپ وقفے کے دوران اسکول کے پارک میں بیٹھا تھا۔ اسی دوران سلیم نے یہ بات چھیڑی تھی۔ سلیم اپنی موٹی توند کے باعث ہمارے درمیان موٹو کے لقب سے مشہور تھا۔

کارنامے سے باتوں کا رخ کسی اور طرف ہوگیا۔ اتنے میں شیراز نے ایک طرف اشارہ کیا: ''ارے! وہاں دیکھو، دل چسپ تماشا۔''

سب نے اس طرف رخ کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی درخت کی شاخ پکڑے جھول رہا ہے۔ ''ارے! یہ ہمارے پارک میں لنگور کب سے آنے لگے؟'' موٹو بڑبڑایا۔

''بے وقوف! وہ لنگور نہیں، ہماری کلاس کا لڑکا نبیل ہے، چشمہ لگا کر دیکھو۔'' میں نے موٹو کی گود سے چشمہ اُٹھا کر اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ وہ چشمہ پہننے کے باوجود دونوں ہاتھوں سے اُسے تھامے غور سے اس جانب دیکھنے لگا.....

پارک کے ایک طرف کچھ گھنے درخت تھے۔ ان میں سے ایک بہت پرانا تھا، جس کی شاخیں اچھی خاصی لٹکی ہوئی تھیں۔ وہاں ہمارا ہم جماعت نبیل درخت پر اچھل کود کر رہا تھا۔ وہ بہت اچھا لڑکا تھا.... پڑھائی میں آگے آگے.... ہمیشہ پوزیشن حاصل کرتا.... سب سے اچھے طریقے سے پیش آتا۔ بس اس کے ساتھ ایک مسئلہ تھا، وہ یہ کہ اس کا قد دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا۔ سیکنڈری کے بجائے وہ پرائمری کا بچہ لگتا۔ کلاس کے کئی لڑکے اسے مختلف ناموں سے پکار کر تنگ کرتے رہتے..... ہم سب غور سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''وہی اس کا پرانا مسئلہ ہے قد چھوٹا ہونے کا۔ اسی وجہ سے درخت کے ساتھ زور آزمائی کر رہا ہے۔ آج تیسرا دن ہے اس کا درخت کے ساتھ۔'' معروف کے پوچھنے پر میں نے قدرے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر اچھل کود کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھ گیا۔

''اوہ!'' اچانک موٹو کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ جلدی بولا: ''شیراز! ذرا بھاگ کر اسے بلانا تو۔'' سب نے چونک کر موٹو کی طرف دیکھا مگر اس کی نظریں تو بدستور نبیل پر ایسی جمی تھیں کہ اردگرد کا ہوش نہ تھا۔ شیراز بھاگتا ہوا نبیل کو بلا لایا۔ وہ شرماتا ہوا قریب آیا اور ہمارے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ موٹو نے اس کی طرف بن کباب بڑھایا جسے اُس نے جھجکتے ہوئے لے لیا اور کھانے لگا.....

کچھ دیر بعد موٹو نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں اس سے پوچھا: ''دوست! کیا بات ہے؟ اُداس دکھائی دیتے ہو۔''

یہ سننا تھا کہ وہ آب دیدہ ہو گیا اور اس نے نہایت دکھ بھرے لہجے میں اپنے چھوٹے قد کا رونا رو دیا.....

''بس اتنی سی بات؟'' موٹو چٹکی بجاتے ہوئے بولا، جیسے اس کی نظر میں یہ کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔

نبیل نے حیرت سے پلکیں جھپکا کر اسے دیکھا۔ موٹو پھر گویا ہوا: ''تم چھوٹے قد کی وجہ سے پریشان ہونا!! فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کردوں گا تمھارا مسئلہ حل۔''

''وہ کیسے؟'' نبیل کے ساتھ کئی ایک کے منہ سے نکلا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ اگر ہم نے تمھیں خوش کر دیا تو کیا تم

ہمیں خوش کرو گے؟'' موٹو نے ہاتھ میں رکھے بن کباب کی طرف اشارہ کیا تو وہ جوش سے بولا:

''بالکل! کیوں نہیں۔ سب کی میری طرف سے شان دار دعوت ہوگی۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' موٹو اُس کے ہاتھ پر تالی مارتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ موقع دیکھتے ہوئے میں نے نبیل کو سمجھانا چاہا کہ قد بڑا ہونے کے چکر میں مت پڑو۔ تم کلاس میں اچھی کارکردگی کی بنا پر آگے ہی ہو۔ باقی یہ قد کا معاملہ کوئی.....

میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی موٹو میرا سر ایک طرف جھکاتے ہوئے چپکے سے بولا: ''یار! کیوں اپنی روزی روٹی پر لات مارتے ہو۔ بڑے عرصے بعد کسی دعوت کا موقع مل رہا ہے۔ تم اپنی نصیحت کی پٹاری بند ہی رکھو۔'' پھر نبیل کی طرف متوجہ ہوا: ''بس، اب بے فکر ہو جاؤ۔ چند ہی دنوں میں ہم تمھارا مسئلہ حل کر دیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی وقفہ ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور ہم نے اپنی کلاس کی راہ لی۔

اگلے دن وقفے میں ہم سب نبیل کے قد کے مسئلے پر زور وشور سے بحث کر رہے تھے..... ہر ایک اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا:

''اگر اُسے مرغی کی طرح الٹا لٹکا دیں تو.... ہو سکتا ہے تین دن تک مسلسل درخت سے لٹکا رہنے سے کچھ فائدہ ہو جائے۔'' شیراز نے رائے دیتے ہوئے سب کی طرف دیکھا۔

شیراز کی بے تکی بات پر باقی تو اسے گھور کر رہ گئے لیکن ندیم نے ہونق کی طرح اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''مرغی کو لٹکانے سے اس کا قد بڑا ہوتا ہے کیا؟''

''اور ویسے بھی مرغی کو تو بال اور کھال اتار کر لٹکایا جاتا ہے۔'' معروف نے لقمہ دیا۔

''میرے خیال میں اس کے قد کو بڑھانے کا ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر کھینچے جائیں۔ ندیم نے اپنے تئیں دانش مندانہ رائے پیش کی۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تمھاری عقل گھاس چرنے اپنی مقررہ جگہ پہنچ چکی ہے۔'' میں نے جل کر کہا۔

''وہ کیوں؟'' اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

''احمق! اس طرح تو اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''تم بھی کچھ کہو۔'' شیراز نے میری طرف رخ کیا تو میں نے کہا: ''بھئی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بہتر ہے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور مٹی پاؤ اس مسئلے پر۔''

''ایسا تو خیر نہیں ہو سکتا۔'' موٹو گہری سوچ میں گم بولا۔

''تو پھر تم ہی بتاؤ نا۔ کیا تم نے کوئی ترکیب سوچ لی ہے؟'' معروف نے اس سے پوچھا۔

"فکر نہ کرو، آجائے گی ترکیب بھی ذہن میں۔ ویسے یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ اگر اس کا قد نکل آیا تو ہماری شہرت ہو جائے گی اور ساتھ میں دعوت بھی اُڑا لیں گے۔ اس کے علاوہ ہماری نیک نامی میں اضافہ بھی ہو جائے گا۔" وہ جلدی جلدی سموسے کا آخری نوالہ ٹھونستے ہوئے بولا۔

"لیکن اگر اس کا قد بڑا ہونے کے بجائے اور چھوٹا ہو گیا تو؟" ندیم نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔ یہ سن کر موٹو اسے گھور کر رہ گیا۔

اگلے دن جب ہم سب نے موٹو کو خوش گوار موڈ میں دیکھا تو پوچھ بیٹھے: "لگتا ہے کوئی ترکیب ذہن میں آ گئی ہے؟"

"کوئی ایسی ویسی ترکیب۔ سنو گے تو رشک کرو گے میری ذہانت پر۔" اس نے فخر سے کہا۔

"جلدی سے بتاؤ نا۔" مارے بے چینی کے سب کا برا حال تھا۔

موٹو نے ذرا سا کھانس کر کہنا شروع کیا: "اصل میں نبیل کے درخت پر لٹکنے کو دیکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ صرف ایک جانب سے اپنا علاج کر رہا ہے جب کہ اس کو دونوں جانب سے علاج کی ضرورت ہے۔"

"کیا مطلب؟" بے ساختہ ہر ایک کے منہ سے نکلا۔

"مطلب یہ کہ جب وہ درخت پر لٹکتا ہے تو صرف ایک جانب سے کھنچتا چلا جاتا ہے مگر دوسری جانب یعنی زمین کی طرف سے نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ نیچے سے زمین تو اس کو کھینچنے سے رہی۔ اس لیے وہ اپنے تجربے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے دوسری جانب سے بھی کھینچا جائے، جیسے ربڑ دونوں طرف سے کھینچنے سے ہی بڑی ہوتی ہے، صرف ایک طرف سے نہیں۔ اسی طرح ہم بھی اس کو ہاتھ اور پاؤں دونوں طرف سے کھینچیں گے۔" موٹو کی نرالی ترکیب سن کر سب اَش اَش کر اٹھے اور دل کھول کر اسے داد دی۔

شیراز بولا: "موٹو بھائی! ترکیب تو خوب بتلائی، اب یہ بتاؤ کہ اسے عملی پاجامہ کب پہنانا ہے؟"

"پاجامہ نہیں، الو! جامہ، عملی جامہ... کتنی بار کہا ہے تمھیں؟" موٹو نے جھلاتے ہوئے کہا تو وہ سر کھجاتے ہوئے بولا: "ہاں ہاں، وہی۔ زبان پھسل گئی۔"

"بس، آج کا دن جانے دو۔ کل ہی ہم یہ کارنامہ سر انجام دیں گے۔" پھر اگلے ہی دن نبیل سمیت سب پارک میں جمع تھے۔

"اچھا نبیل! کچھ ہی دیر میں ہم وہ عمل شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ ہماری محنت رنگ لائے گی۔ اگر تمھارا قد نکل آئے تو بتا دینا۔" موٹو بولا۔

"مم... میں کیسے بتاؤں؟" وہ بوکھلایا۔

بقیہ صفحہ نمبر ۱۱۲

ظفر شمیم

آگ اور برف ایک ساتھ..... اس کا نظارہ آپ اس تصویر میں کر سکتے ہیں۔ یہ ۱۵،۵۸۴ فٹ بلند آتش فشاں پہاڑ Klyuchvskoy ہے جو آخری بار ۱۹۵۶ء میں پھٹا تھا۔ اسے ایشیا کا بلند ترین آتش فشاں پہاڑ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ روسی علاقے کچاٹکا میں واقع ہے۔ ان کے چوٹیوں سے اُٹھتا دھواں ٹھنڈا نہیں بلکہ انتہائی گرم ہوتا ہے جو پہاڑ کی اتھاہ گہرائیوں میں کھولتے آگ اور لاوے کے دریا سے اُٹھتا ہے۔

Steller Sea Lion شمالی امریکا اور ایشیا کے برفانی ساحلوں پر ملتے ہیں۔ ان کی آبادی کا تخمینہ ۶۸۰۰ تک ہے۔ ۲۳۰ سینٹی میٹر لمبا یہ حیوان گوشت خور ہے اور مچھلیوں کا ماہر ترین شکاری ہے۔ نر کا وزن ۵۶۰ کلو اور مادہ کا ۲۶۰ کلو وزنی ہو سکتا ہے۔ مقامی آبادی اس جانور کا شکار کر کے اس کا گوشت کھانے کے لیے اور کھال کو بطور لباس استعمال کرتی ہے

ستمبر کے مہینے میں

ضیاء اللہ محسن

ستمبر کے مہینے میں ، ستم گر یاد آتے ہیں
سبھی قصے شجاعت کے برابر یاد آتے ہیں
میں اک چھوٹا سا بچہ ہوں میری امی بتاتی ہیں
شہیدوں، غازیوں کی داستانیں وہ سناتی ہیں
بتایا مجھ کو امی نے، تھا کیسا جنگ کا منظر
عدو کیسے چلایا آیا تھا میرے دیس کے اندر
عجب عالم تھا جب، باطل نے حق والوں کو للکارا
تو گونجا تھا فضاؤں میں، وہ اک تکبیر کا نعرہ

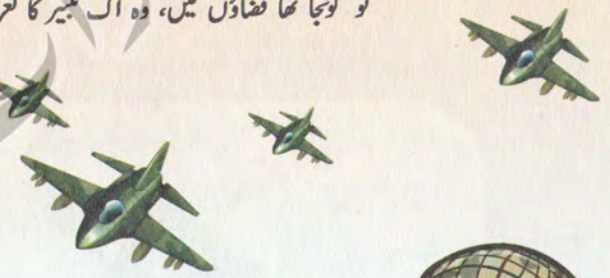

تبھی ہر ایک دل میں آرزو اُٹھی شہادت کی
خدا کا فضل تھا ہم پہ خدا کی خاص نصرت تھی
ہماری قوم تھی یک جان، اور جذبہ مثالی تھا
مقابل جنگ میں جو تھا، وہ ان جذبوں سے خالی تھا
وطن کے بوڑھے، بچے اور جواں سب جاگ اُٹھے تھے
بڑے ارمان لے کر آئے تھے جو، بھاگ اُٹھے تھے
بہادر ماں کے بیٹے جو وطن پہ جان دیتے ہیں
وہ اپنے دیس کو اک منفرد پہچان دیتے ہیں
میری امی یہ کہتی ہیں کہ بیٹا یاد رکھنا تم
ہمیشہ اپنے دل میں دیس کو آباد رکھنا تم
ارادہ ہے مرا محسنؔ ، کچھ ایسا کام کرنا ہے
کہ اپنے دیس کا روشن مجھے اب نام کرنا ہے

قطب شمالی کے سرد سمندر میں

قاضی مظہر الدین طارق

بچو! میں پانی کا ایک سالمہ..... اپنے سفر کی کہانی سنا رہا ہوں..... اس وقت میں قطب شمالی کے سمندر میں غوطہ زن ہوں..... کبھی اوپر جاتا ہوں..... کبھی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہوں..... آزاد ہوں تفریح کرتا پھر رہا ہوں..... کاش میں اتنا بڑا ہوتا کہ آپ کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا..... مگر میں تو اتنا چھوٹا ہوں کہ بصری خوردبین (مائیکروسکوپ) سے بھی نظر نہیں آتا۔

سمندر میں نیچے گیا تو دیکھا کہ یہاں بہت سے جاندار ہیں..... پھر اوپر آیا تو دیکھا پانی پر برف تیر رہی ہے، اور اس برف کے اوپر بھی برفانی سفید ریچھ، سیل اور والرس اور بہت سے پرندے رہ رہے ہیں، پرندوں میں سے اُڑنے والے بھی ہیں اور پنگوینز کی طرح زمین پر چلنے والے بھی۔

برف سے نیچے آیا تو دیکھا کہ برف اور پانی کے بیچ میں بھی زندگی نظر آرہی ہے۔ یہ برفانی کائیاں ہیں، کائی ہے تو واحد خلوی مگر بہت ساری مل کر ایک لڑی بناتی ہیں اس لیے ساری دنیا کے پانیوں میں ہری ہری نظر آتی ہیں..... ان کے ساتھ ہی پانی کے پودے بھی ہیں جو پانی میں ڈولتے رہتے ہیں..... یہاں سورج کی بہت کم روشنی پہنچتی ہے..... اسی روشنی سے ضیائی تالیف کر کے یہ دونوں غذا اور آکسیجن بنا رہی ہیں..... یہ دونوں بنیادی غذا بنانے والے ہیں..... مگر نہیں! میں نے دیکھا کہ یہاں کوئی اور بھی ہے جو یہی کام کر رہا ہے۔

یہ واحد خلوی بکٹیریا 'نباتی پلینکٹن' ہیں..... یہ خردبینی مخلوق ہیں، بغیر خردبین کے نظر بھی نہیں آتی..... یہ پانی کے پودے، کائی اور پلینکٹن نہ ہوتے تو سمندر کی باقی ساری مخلوق بھوکی مر جاتی۔

میں دیکھتا چلا گیا..... ان نباتی پلینکٹن کو خردبینی 'حیوانی پلینکٹن' کھا رہے ہیں کیوں کہ حیوان خود غذا نہیں بنا سکتے تو رب تعالیٰ نے ہی 'نباتی' کو 'حیوانی' کا رزق بنایا اور ان کو کھا کر زندہ رہنے کا حق دیا، مگر اللہ نے یہ حق صرف بھوک مٹانے کی حد تک دیا ہے، انسان کی طرح ظلم اور تفریح کے لیے نہیں۔

پھر میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ ان سے بڑے حیوانی پلینکٹن (جیسے 'کوپوڈ' اور 'کرلز) نباتی پلینکٹن، خرد بینی حیوانی پلینکٹن، پانی کے پودے اور برفانی کائی سب کو کھا رہے ہیں، یہ ان کا رزق ہے۔

پھر ان بڑے پلینکٹن کو، جیلی مچھلیاں، لاروا مچھلیاں، چھوٹی مچھلیاں، اور حتیٰ کہ بڑی وہیل مچھلیاں بھی کھا رہی ہیں۔

پھر میں اور نیچے چلا تو دیکھا یہاں پرانی کائی، مختلف جانداروں کے مردہ اجسام اور فضلے سمندر کی تہہ میں بیٹھتے جا رہے ہیں، ان کو یہاں بسنے والے جاندار جیسے: ارچن، ستارہ مچھلیاں اور سیپیاں کھا رہی ہیں۔

واپس مڑا تو دیکھا کہ برف کے اوپر رہنے والے سیل اور والرس مچھلیوں کو کھا رہے ہیں اور برفانی ریچھ ان سب کو کھا رہا ہے۔ اس طرح یہ سمندر میں اور قطبین پر غذا کی فراہمی کا نظام ہے اس کو غذائی جال کہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ اللہ رب رزاق نے ان سب کو پیدا کیا ہے، سب کو زندہ رہنے کے لیے رزق کا انتظام کیا ہے اور ایک ایسا میزان قائم کیا ہے کہ غذائی جال کے شروع میں بنیادی غذا بنانے والے پھر ایک کے بعد ایک ان کے صارف (کنزیومر) ہیں، سمندر میں وہیل اور دیگر جاندار بڑوں کے ساتھ چھوٹے غذا بنانے والے نباتی پلینکٹن اور ان کو کھانے والے بڑے پلینکٹن کو بھی کھاتے ہیں، برف کے اوپر برفانی ریچھ، سیل، وارس کے ساتھ مچھلیوں کو بھی کھاتا ہے۔

یہ ایک ایسا جال ہے جس سرے والے یا درمیان

والے کسی کو بھی کسی طرح ہٹا دیا جائے تو یہ حیاتی میزان قائم نہیں رہے گا، اس میزان (بیلنس) کی ہر وقت نگرانی سوائے ربِ قادر کے کوئی کر سکتا ہے؟

اب میں گھوم پھر کر تھک گیا ہوں ..... کسی پڑاؤ کی تلاش میں ہوں..... میں نے سوچا چلو کائی (الگی) کے ایک خلیے میں گھس جاؤں۔

جیسے ہی میں نے ایک کے دروازے پر دستک دی، ایک خوفناک محافظ باہر آیا اور آتے ہی سولات کی بوچھاڑ کر دی..... ''کہاں سے آئے ہو؟''.....

''کیا کچھ لے کر آئے ہو؟''.....

''کیوں آئے ہو؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا: ''آسمان سے آیا ہوں۔ نہیں! کچھ نہیں لایا..... میں تو گھومنے پھرنے نکلا تھا..... اس سفر کی کہانی بچوں کو سناؤں گا..... تاکہ وہ رب تعالیٰ کی نشانیوں سے واقف ہوں اور اس کا شکر ادا کریں!''

اس نے کہا ''ٹھیرو! میں مرکزے سے پوچھ کر آتا ہوں!''

پھر جلد ہی وہ لوٹ آیا بولا ''ہم بھی رب کا شکر ادا کرنے والے ہیں، آؤ اندر! بچے ہم کو بھی بہت محبوب ہیں!''

میں اندر داخل ہوا تو ایک نئی ہی دنیا تھی..... میں بڑی مشکل میں پڑ گیا..... میرے جیسے بہت سے پانی کے سالمے تھے..... جن کے درمیان بہت سے اجنبی سالمے بھی تھے..... یہاں مجھے اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا، ضیائی تالیف کے لیے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیے جا سکتے ہیں میرے اندر کی آکسیجن اور ہائیڈروجن کو الگ الگ یا جا سکتا ہے اور میری موت واقع ہو سکتی ہے..... اگر میں مر گیا تو بچوں کو یہ کہانی کیسے سناؤں گا؟

☆.....☆

چمن

ایک شاعر مشاعرے میں اپنا کلام سنا رہے تھے۔

شعر: ''اس چمن سے کبھی تم جھانکو کبھی ہم جھانکے''

شاعر صاحب شعر کا دوسرا مصرعہ بھول گئے تو انھوں نے پہلا مصرعہ دہرایا۔

''اس چمن سے کبھی تم جھانکو کبھی ہم جھانکے.....''

انھیں جب دو بار پہلا پڑھنے کے باوجود بھی دوسرا مصرعہ یاد نہ آیا تو انھوں نے تیسرا مرتبہ پہلا ہی مصرعہ دہرایا۔

''اس چمن سے کبھی تم جھانکو کبھی ہم جھانکے.....''

شاعر صاحب کو جب بار بار کی مشق کے بعد بھی دوسرا مصرعہ یاد نہ آیا تو سامعین میں سے کسی کسی کی آواز آئی۔

''لگا دو آگ اس چمن کو نہ تم جھانکو نہ ہم جھانکیں۔''

مرسلہ: فضہ ناز، کراچی

کوشش کا خانہ مکمل

تحریر	قلم کار	کیفیت
ہم شکل	م۔ع۔ع	کہانی میں جھول ہے
سچ کی جیت	م۔ح۔خ	جذباتی تحریر
ننھے دل کی فریاد	ا۔ع۔ح۔ا	ساتھی کے مزاج کے مطابق نہیں
گداگری ایک لعنت آمیز پیشہ	س۔ف۔ت	مزید محنت کی ضرورت
موٹو بھائی اور ہنڈا 70	ن۔ا	مزید محنت کی ضرورت
کامیاب آئیڈیا	ن۔ا	عمومی آئیڈیا
چھٹیوں کی روداد	م۔ج	غیر ضروری طوالت
ہم بنے روزہ دار	ا۔ع	بے ربط تحریر
گلنار پری	ر۔ن	ساتھی کے مزاج کی نہیں
سچی خوشی	ع۔ن۔ح	عمومی انداز
سچ جھوٹ کا ملاپ	م۔ع۔ج۔ا	والدین کو تشدد دکھایا گیا ہے
تابندہ ستارہ	س۔ا	اس موضوع پر تحریر آچکی ہے
تعلیم محض ذریعہ کمائی نہیں	ز۔ع	مزید محنت کی ضرورت
انجلینا بیلیر ینا	ع۔ف	ساتھی کے مزاج کی نہیں
انمول ہستی	ن۔ط	آئیڈیا جاندار نہیں
یہ وطن ہمارا ہے.....	ن۔ل	عمومی خیال
انعام	ع۔ش	عمومی خیال
ورلڈ کپ کی باتیں	ف۔م۔ف	تاخیر سے موصول ہوئی
رزق حلال	ک۔ف۔ا	غیر حقیقی خیال
ہمارے پیارے نبی	م۔ط	مزید محنت کی ضرورت

حیرت انگیز دعوت

ترجمہ: گل رعنا

بچوں نے جب جانوروں جیسی حرکتیں شروع کردیں تو ایک عجیب بات ہوئی

قصبے کے تمام بچے بہت پرجوش تھے۔ ان کے لیے ایک دعوت کا بلاوا آیا تھا۔ یہ دعوت میڈم ٹوئنکل کی طرف سے تھی۔ میڈم ٹوئنکل ایک حیرت انگیز شخصیت کی مالک تھیں۔ وہ مختلف قسم کے جادوئی کرتب اور کھیل جانتی تھیں اور بہت خوش مزاج خاتون تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ سب بچے اس دعوت میں جانے کے مشتاق تھے۔

"تم لوگوں کو تمیز کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔" بچوں کی اُستانی نے کہا: "میڈم ٹوئنکل کو لالچی اور بدتمیز بچے بالکل بھی پسند نہیں لہٰذا اس بات کا خیال رکھنا۔"

دعوت والے دن سب بچے بہت اچھی طرح تیار ہوئے اور میڈم ٹوئنکل کے گھر پہنچے۔ ان کا گھر بہت خوب صورت تھا اور ان کے نام کی طرح چمک رہا تھا۔ گھر کے باغ میں طرح طرح کے پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ میڈم ٹوئنکل نے سب بچوں کو خوش آمدید کہا "دن بخیر بچو! تم سب لوگ بہت اچھے لگ رہے ہو۔"

"مجھے اُمید ہے کہ ہمیں ناشتے میں اچھی، اچھی چیزیں کھانے کو ملیں گی۔" پیٹر نے ٹام کے کان میں سرگوشی کی۔ میڈم ٹوئنکل کے کان بہت تیز تھے۔ ان کے

کانوں نے یہ سرگوشی سن لی۔ ان کی تیوری چڑھ گئی۔

"پیارے بچو! آج کی دعوت آپ سب کے لیے بہت منفرد اور دلچسپ ثابت ہوگی۔ تاہم آپ لوگ اپنے رویے کے بارے میں ذرا محتاط رہیے گا۔ میں آپ لوگوں کو کچھ جادوئی کرتب دکھاؤں گی۔" میڈم ٹوئنکل نے سب بچوں کو رنگین غبارے دیتے ہوئے کہا۔ بچے نہایت ذوق وشوق سے غبارے اُڑانے لگے۔ وہ بہت خوش تھے اور پھر گلوریا نے اپنا غبارہ کھیلتے کھیلتے ایک جھاڑی کے قریب پھینکا تو وہ ایک کانٹے سے اُلجھ کر پھٹ گیا۔ گلوریا گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگی۔ میڈم ٹوئنکل گھبرائی ہوئی بھاگی چلی آئیں۔

"گلوریا! خیر تو ہے۔ تمھیں کہاں چوٹ لگی ہے؟ دکھاؤ، خون تو نہیں نکل رہا۔" وہ پریشان ہو کر بولیں۔

"میرا غبارہ پھٹ گیا ہے۔" وہ چیخ کر بولی اور میڈم ٹوئنکل کا منھ بن گیا۔

"اچھا تو بطخ کی طرح چلا کیوں رہی ہو؟" میڈم ٹوئنکل نے سختی سے کہا اور پھر ایک بہت عجیب واقعہ ہوگیا۔ گلوریا ایک بطخ میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے اپنی چونچ مزید رونے کے لیے کھولی مگر وہ بطخ کی طرح قائیں قائیں کر کے رہ گئی۔

"او! یہ ضرور آپ کا جادوئی کمال ہے۔" بچے خوشی سے چلائے۔

"ہاں اور تم لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے تمھیں پہلے ہی خبردار نہیں کیا تھا۔ مت رو گلوریا! یہ جادو خود ہی ختم ہو جائے گا۔"

"آنٹی! کیا آپ کو میرا خوب صورت ڈریس پسند آیا؟ یہ میری آنٹی نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔" پولی نے کہا جو ایک ننھی، گھمنڈی لڑکی تھی اس نے چاروں طرف سے گھوم کر اپنا بیش قیمت فراک میڈم ٹوئنکل کو دکھایا۔

"پولی! تم تو بالکل مور کی طرح مغرور ہو۔" میڈم ٹوئنکل نے ناگواری سے کہا۔

اس کے ساتھ ہی پولی ایک مور میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے رونے کے لیے منھ کھولا مگر ایک بھیانک اور نوکیلی آواز نکال کر رہ گئی۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔" بوبی نے خطرے کی گھنٹی بجتے ہوئے محسوس کر لی۔

"آؤ بچو! چائے پی لو۔" میڈم ٹوئنکل نے کہا اور سب بچے اندر بھاگے۔ اندر ناشتے کا زبردست اہتمام تھا۔ پیٹر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ بہت لالچی لڑکا تھا۔ اس نے بڑھ بڑھ کر کیک، بسکٹ، سینڈوچز اور کبابوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے بچے اس کو حیرت سے دیکھنے لگے۔

"تم بکری کی طرح لالچی ہو پیٹر! سب کچھ چر جاتے ہو۔" بوبی نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی پیٹر بکری بن گیا۔ اب کرسی پر ایک بکری بیٹھی ممیا رہی تھی۔ سب بچے ہنسنے لگے۔

"بچو! تم لوگوں کو جو چیز پسند ہو وہ بلا تکلف کھا سکتے ہو۔" میڈم ٹوئنکل نے کہا۔ سب بچے اپنی اپنی پسند کی چیزیں نکال کر کھانے لگے سوائے ڈک کے۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کوئی اس سے کھانے پر اصرار کرے تو وہ کھانا شروع کرے۔ مگر ظاہر ہے کہ سب کھانے پینے میں مصروف تھے لہٰذا کسی نے اس سے کھانے پر اصرار نہیں کیا۔ ڈک بہت اُداس ہوا۔ کافی دیر تک وہ خالی پلیٹ اپنے سامنے رکھ کر بیٹھا رہا اور پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"کیا بات ہے ڈک؟ کیا تم بیمار ہو؟" میڈم ٹوئنکل نے پوچھا۔

"نہیں..... مگر کسی کو میری پروا نہیں ہے۔ سب خود کھانے بیٹھ گئے اور مجھ سے کسی نے پوچھا تک نہیں کہ میں کیا کھاؤں گا۔ میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا۔" ڈک نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"افوہ! کیا میں نے تم سب لوگوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ جس کو جو پسند ہو وہ کھا سکتا ہے؟" میڈم ٹوئنکل نے بے صبری سے کہا۔

"تم بالکل گدھے ہو!" اور ڈک ایک ننھا سرمئی گدھا بن گیا۔ دوسرے بچے ہنسنے لگے۔

"کیا میں تمھارے کھانے کے لیے کچھ جھاڑیاں لاؤں پیارے ڈک؟" مارٹن نے کہا اور دوڑ کر باغ سے کچھ جھاڑیاں لے آیا۔

نہیں جانتے

استاد احمد سے: "اگر میں تمھارے چھوٹے بھائی کو پچاس روپے دوں اور اس سے دس روپے لے لوں تو بعد میں اس سے میں کتنے روپے اور لے سکتا ہوں۔"

احمد: "ایک روپیہ بھی نہیں۔"

استاد: "میرے خیال میں تم ریاضی بالکل بھی نہیں جانتے۔"

احمد: "جناب! آپ بھی میری تائید کرتے مسئلہ یہ ہے کہ آپ میرے بھائی کو نہیں جانتے۔"

مرسلہ: بلال سہیل، کراچی

کنجوس

ایک کنجوس آدمی نے اپنے پسندیدہ رسالے کے مدیر کو خط بھیجا۔ "اگر آپ اپنے رسالے میں کنجوسوں سے متعلق لطائف شائع کرتے رہے تو میں آئندہ اپنے ہمسائے سے آپ کا رسالہ مانگ کر نہیں پڑھوں گا۔"

مرسلہ: محمد سلمان فاروق، کراچی

اسے ڈک کے منھ میں جھاڑیاں ٹھونستے دیکھ کر میڈم ٹوئنکل نے ڈانٹا۔

"مارٹن! تم بالکل بندروں والی حرکتیں کر رہے ہو۔" اور اس کے ساتھ ہی مارٹن بندر بن گیا۔ بچوں کے قہقہے گونج اُٹھے۔

"بہت خوب! میرا گھر تو چڑیا گھر میں تبدیل ہوتا نظر آ رہا ہے۔" میڈم ٹوئنکل نے وہاں موجود جانوروں

اور پرندوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''خیر! اب تم سب باغ میں جا کر لنگڑی چال کھیلو۔ جب تک میں چائے کے برتن دھو لیتی ہوں۔'' سب بچے باغ میں آ کر لنگڑی چال کھیلنے لگے۔ ''فینی چیٹنگ کر رہی ہے۔ ابھی اس نے اپنا دوسرا پاؤں بھی زمین پر رکھا ہوا تھا۔'' این چلائی۔

''تم خود بے ایمانی کر رہی ہو۔ ابھی تمھارے بھی دونوں پاؤں زمین پر تھے۔'' جون چلایا۔

''اور تم بڑے ایماندار ہو۔'' یہ کہہ کر این نے اسے دھکا دیا۔ جون نے بھی ایک جوابی دھکا دیا۔

''دوبارہ شروع کرو، تم لوگ بے ایمانی کر رہے ہو۔'' ٹام چلایا۔

''جولی! میری فراک پکڑ کر مت کھینچو، تم اسے پھاڑ دو گی۔'' ایمی نے گلا پھاڑا۔ جون نے جولی کو مارا اور اس نے جون کو جوابی تھپڑ مارا۔ ایمی نے فینی کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔ وہ سب چیخ چیخ کر لڑ رہے تھے اور مار پیٹ میں مصروف تھے۔

میڈم ٹوئنکل دوڑتی ہوئی باہر آئیں۔ وہ بہت غصے میں لگ رہی تھیں۔ کیا یہ بچے صرف دس منٹ کے لیے بغیر لڑے اور چلائے نہیں کھیل سکتے ہیں۔ ''کتے، بلیوں کی طرح لڑنا بند کرو، کچھ تو شرم کرو۔'' ان کے چلاتے ہی سب لڑنے والے بچے کتے اور بلیاں بن گئے۔ میاؤں میاؤں اور بھوبھو کی آوازوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ میڈم ٹوئنکل نے ان سب کی جانب دیکھا۔ ''بطخ، مور، بکری، گدھا، بندر اور بے شمار کتے اور بلیاں! کیا دعوت ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''خوب! میں بچوں کی ایک دعوت کرنا چاہتی تھی نہ کہ ایک زومیٹنگ (Zoo Meeting) بہتر ہے کہ تم سب لوگ اپنے گھر جاؤ۔ جس بچے نے بھی دل میں جانوروں جیسی حرکتوں سے توبہ کر لی اس پر سے جادو کا اثر دور ہو جائے گا۔''

لہٰذا بطخ، مور، بکری، گدھا، بندر، کتے اور بلیاں یہ سوچتے ہوئے غمگین سے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے کہ ان کے گھر والے انھیں اس حلیے میں دیکھ کر کیا کہیں گے۔ مگر آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ جیسے ہی بچے اپنے اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے، وہ دوبارہ سے بچوں اور بچیوں میں تبدیل ہو گئے۔ سب بچوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

کتنی حیرت انگیز دعوت تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے، اگر آپ اس دعوت میں شریک ہوتے تو کیا آپ بھی کسی جانور یا پرندے کا روپ اختیار کر سکتے تھے؟ اگر ہاں تو آپ کیا بنتے؟ ذرا سوچیے!

یارب تیرے در پر آئے

نعیم الدین نعیم

ہاتھ اٹھائے سر کو جھکائے — لب پر تیری حمد سجائے
دل میں تیری یاد بسائے — شمع امید جلائے
یارب تیرے در پر آئے — یارب تیرے در پر آئے
دنیا پیاری تو نے بنائی — چاند ستاروں سے ہے سجائی
ہر ذرہ تیرا شیدائی — ہر شہ پر ہے تیری خدائی
ہر شہ جھلک تری دکھلائے
یارب تیرے در پر آئے

الفاظ کی ترتیب کا خیال رکھیں

اطہر ہاشمی

(مدیر اعلا روزنامہ 'جسارت')

ٹھیک ہے، عید گزر چکی لیکن ساتھیوں کو عید مبارک، خوب عیدی جمع ہوگئی ہوگی۔ جن ساتھیوں نے روزے رکھے، اللہ قبول کرے اور خیر کثیر عطا کرے۔ یہ کثیر کا لفظ ہمیں آج بھی اُلجھن میں ڈالتا ہے کہ ''س'' سے لکھیں یا ''ث'' سے۔ کچھ دیر سوچنا پڑتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو بھی ایسی کسی اُلجھن کا سامنا ہوتا ہو۔

جولائی کا شمارہ حسب معمول جان دار اور شان دار ہے۔ ہمیں بھی پینٹنگز کا راز، کے دوسرے حصے کا انتظار تھا۔ پہلا حصہ زیادہ جان دار تھا۔ ایک مجرم کی مصوری اور وہ بھی اتنی زیادہ کہ قدم قدم پر تصاویر لگادیں، یہ آئیڈیا کچھ مزے کا نہیں لگا، ساتھیوں کو مزہ آیا ہو تو ٹھیک ہے۔ جہاں تک ''مزہ'' کا تعلق ہے تو یہ ہائے ہوز کے علاوہ الف سے یعنی ''مزا'' بھی درست ہے۔ اب جس کو جیسا مزہ آئے وہ ویسا ہی لکھ دے۔ اور ساتھیو! یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ''ہائے ہوز'' کیا چیز ہے۔ ح اور ہ میں تمیز کے لیے حائے حطی اور ہائے ہوز کہہ کر اپنی قابلیت کا اظہار کیا جاتا ہے ورنہ عوامی زبان میں تو حلوے والی ح اور ہاتھی والی ہ سے وضاحت کردی جاتی ہے جو آسان بھی ہے۔ یہ حطی اور ہوز ویسے تو عربی کے الفاظ ہیں لیکن سعودی عرب میں جب ہم نے ایک عرب صحافی کو مرعوب کرنے کے لیے اپنی قابلیت کا اظہار کیا تو وہ بڑا حیران ہوا کہ یہ کیا ہے۔ ہم نے کہا بھئی تم لوگ کیسے فرق کرتے ہو تو موصوف نے حلق کے اندر سے آواز نکال کر کہا حا، حا ہے اور زبان دانتوں سے لگا کر ہلکی آواز میں کہا، ہا، ہا ہے۔ عرب عربی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرتے ہیں، ان کی زبان جو ہوئی۔ ہم جیسے غیر عرب تو س۔ ث۔ ص کا تلفظ ایک ہی طرح سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن اردو تو ہماری اپنی زبان ہے، ہمیں بھی اپنی زبان کی حفاظت ''ہر طرح'' کرنی چاہیے۔

لکھنے میں بھی تھوڑی سی احتیاط درکار ہے، خاص طور پر

الفاظ کی نشست و برخاست کا خیال رکھا جائے یعنی ترتیب درست ہو۔ یہ نہ ہو تو بات تو سمجھ میں آجاتی ہے مگر فصاحت متاثر ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھی ابھی سے اس کا خیال رکھیں آخر ان میں سے کئی بڑے ادیب بھی تو بنیں گے (ان شاءاللہ)۔ مثال کے طور پر صفحہ 40 پر ایک جملہ ہے ''مزید سفیدے اور کیکر کے پودے۔'' پلاسٹک کی پانی سے بھری بوتلیں۔ اب بات تو سمجھ میں آگئی لیکن اچھی اردو کا تقاضا ہے کہ یوں لکھا جائے ''سفیدے اور کیکر کے مزید پودے، اور پانی سے بھری پلاسٹک کی بوتلیں۔'' ذرا سی توجہ سے یہ عیب دور ہوسکتا ہے۔

محمد ندیم اختر کی کہانی ''آئیڈیا نمبر 70'' بہت اچھی اور سبق آموز ہے۔ بس کہیں کہیں سہو ہوگیا ہے۔ مثلاً ''پاکستان میں جو جنگل ہیں وہ مصنوعی جنگل ہیں'' اس جملے کے بعد یہ لکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ''انھیں مصنوعی طریقے سے اُگایا گیا ہے۔'' علاوہ ازیں پہلے جملے میں جنگل کی تکرار غیر ضروری ہے۔ یہ تو ہوئی فصاحت کی بات لیکن ''درخت وافر مقدار میں لگائے گئے ہیں'' یہ بڑی غلطی ہے۔ مقدار اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے تولا یا ناپا جاسکے۔ یہاں ''تعداد'' ہونا چاہیے تھا۔ (یاد رہے وافر میں ف کے نیچے زیر ہے جسے کسر کہتے ہیں)۔ اس جملے میں بھی ناگوار تکرار ہے ''ہمارا علاقہ ریتیلا علاقہ ہے''۔ دوسرا علاقہ غیر ضروری ہے۔ ریٹائرڈ منٹ (صفحہ 37) کی جگہ ریٹائرمنٹ ہونا چاہیے تھا۔ یہ جملہ بھی اُلجھا ہوا ہے ''وہ کم ہی باہر دیگر محلے کے بچوں کے ساتھ۔'' ایک تو وہی ترتیب کا مسئلہ یعنی ''محلے کے دیگر بچوں'' کے ساتھ یا صرف محلے کے بچوں ہونا چاہیے، دوسرے یہ کہ محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے باہر ہی نکلا جاتا ہے، مناسب تھا کہ یہ جملہ یوں ہوتا ''وہ کم ہی محلے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے جاتے تھے۔'' اور ''کم ہی'' اگر جاتے تھے سے پہلے آجاتا تو کیا ہی بات تھی۔

عزیزم ندیم اختر کا یہ آئیڈیا بلاشبہ بہت عمدہ ہے اور ان میں ایک اچھا کہانی کار بننے کی پوری صلاحیت ہے، وہ دل گرفتہ نہ ہوں۔ ''کئی مہینے سے ماہانہ پنشن بھی نہیں مل رہی۔'' بھائی اس جملے سے ''ماہانہ'' نکال دیں تو بھی گزارہ ہوجائے گا۔

علی اکمل تصور کا ''سرکل'' بھی سبق آموز ہے۔ اگر وہ اس کا عنوان ''دائرہ'' رکھ دیتے تو اچھا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ ''گول دائرہ'' کہتے اور لکھتے ہیں۔ بھئی، دائرہ تو گول ہی ہوتا ہے، بھلا کبھی چوکور یا مستطیل دائرہ بھی دیکھا۔ بنیادی بات یہی ہے کہ ''جس برتن کے پیندے میں سوراخ ہو، اس میں پانی محفوظ نہیں رہ سکتا۔'' اور ہمارے معاشرے میں یا تو بے پیندے کے لوٹے ہیں یا ہر برتن کے پیندے میں سوراخ ہے۔

شعر بھری حسب معمول دلچسپ ہے۔ مرزا عاصی اختر کے شعر میں کمپوزنگ کی معمولی سی غلطی رہ گئی ہے۔ ان کا مصرع یوں شائع ہوا ہے ''جس نے مت مار کر رکھ دی تیری انگڑائی کی''۔ یہاں کر کی جگہ ''کے'' ہونا

چاہیے تھا یعنی ''مت مار کے رکھ دی''۔ گو کہ کراور کے دونوں دوحرفی الفاظ ہیں لیکن ''کر'' میں چوں کہ ''ر'' کا واضح اعلان ہے اس لیے وزن گڑبڑ ہو جاتا ہے جب کہ ''کے'' دب کر نکلتا ہے۔ یوں بھی اگر کوئی لفظ جس حرف پر ختم ہو اس کے بعد آنے والا لفظ اسی حرف سے شروع ہو تو شاعری میں یہ ''عیب تنافر'' کہلاتا ہے۔ ''کر رکھ'' میں یہ عیب بھی پیدا ہو رہا ہے۔ بڑے شعراء اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرزا غالب نے اپنا ایک بہت اچھا شعر اسی وجہ سے نکال دیا تھا جس کے دوسرے مصرعے میں ''نقش پا پایا'' آ رہا تھا۔ کہانیاں ساری ہی دلچسپ ہیں۔ ہم نے بھی چشمہ چڑھا کر شوق سے پڑھیں۔ منافع اسکیم بہت عمدہ ہے۔ کہیں کہیں اصلاح ہو سکتی ہے مثلاً مٹی کے خالی ٹھیکرے''۔ ٹھیکرے عموماً مٹی ہی کے ہوتے ہیں۔ ''بکھرے ہوئے ٹھیکرے'' لکھنا کافی تھا۔ ''روشن دان کی کھڑکی'' (صفحہ 15) کیا ہوتی ہے؟ ''ساری بات کو پڑھ کر'' (صفحہ 16) جب کہ حدید نے یہ بات پڑھی نہیں بلکہ اپنے استاد سے سنی تھی۔ ''اپنے آنچل کے پلو سے''۔ بھائی ضیاء اللہ محسن، کیا صرف آنچل یا پلو کافی نہیں تھا؟ ایسا ہی تھا تو دوپٹے (یا روپٹے) کا پلو پکڑا دیا ہوتا۔ اچھا کہانی کار اپنے کرداروں کے مطابق ہی زبان استعمال کرتا ہے۔ اب ایک غریب رشیدہ مائی، جو بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھی، اس کے منہ سے یہ جملہ کہ ''بیماری کی آخری حد کو چھونے کے بعد صحت یاب ہوا ہے، کردار سے مطابقت نہیں رکھتا۔

وہ تو یہ کہہ سکتی تھی کہ ''میرا نومی پتر مرتے مرتے بچا ہے۔'' یا اللہ کے گھر سے واپس آیا ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ کہانی کار جو کردار پیش کریں اسے خود پر طاری کر دیں۔

صفحہ 103 پر ایک جملہ ہے ''سفید بھیڑ کا بچہ''۔ ہمارا خیال ہے کہ بھیڑ سفید ہی ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے معاشرے میں کالی بھیڑوں کا بہت چرچا رہتا ہے۔ ابھی کچھ دن پہلے ایک اعلیٰ افسر نے کہا ہے کہ پولیس سے کالی بھیڑوں کو نکالیں گے۔ کوئی کہتا ہے صحافت میں کالی بھیڑیں ہیں۔ یہ نظر تو نہیں آتیں۔

''سمجھ نہیں آ رہا'' والی غلطی پختہ ہوتی جا رہی ہے (صفحہ 97)۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا'' لکھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اختر عباس نے ہرن کے بچے کے منہ سے بڑی کام کی باتیں کہلوائی ہیں۔ وہ منجھے ہوئے قلم کار ہیں۔ صفحہ 21 پر سندھ باد کی مصنفہ قانتہ کا نام غلط (قانعتہ) کمپوز ہو گیا ہے۔

امید ہے کہ ہم نے جو بال کی کھال اُتاری ہے اس سے ساتھیوں کے منہ کا مزہ خراب نہیں ہوگا اور عید کی مٹھاس حاوی ہوگی۔ سوئیاں اور شیر خرما تو خوب کھایا ہوگا۔ بعض لوگ شیر خرما کو ''شیر قورمہ'' بھی کہتے ہیں۔ ارے بھئی ''خرما'' تو چھوارے کو کہتے ہیں۔

بلی کی ڈائری

میری ننھی گڑیا

ابن آس محمد

تاریخ: ۳ مارچ

میری کھڑکی سے باہر نظر آنے والے چھوٹے سے باغیچے میں وہ ننھا سا لڑکا کھیل رہا تھا۔ جب وہ دوڑتا، چھلانگ لگاتا یا اچھلتا تو اس کے بال ہوا میں لہرانے لگتے۔ وہ بچہ زندگی سے بھرپور تھا۔ خوش تھا دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ میری عمر کا تھا۔

اور میں..... ہاسپٹل میں اپنے کمرے کے بیڈ پر لیٹی مسرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا۔ کچھ وقت پہلے تک میں بھی اسی کی طرح ہنس مکھ، زندگی سے بھرپور اور خوشیوں سے معمور تھی۔ اس کی طرح ہنستی، کھیلتی اور بھاگتی دوڑتی تھی..... مگر اب.....!

مگر اب میں ہسپتال کے ایک کمرے میں ذہنی اور جسمانی طور پر معذوروں کی طرح پڑی ہوئی تھی۔

کاش..... میں کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرتی اور پھر جب آنکھیں کھولتی تو..... میرا یہ بھیانک خواب ختم ہو چکا ہوتا..... میں ہسپتال کے بیڈ پر نہ ہوتی..... اس لڑکے کی طرح میں بھی کھیل رہی ہوتی۔ کلابازیاں کھا رہی ہوتی۔ تتلیوں کے پیچھے بھاگ رہی ہوتی اور پھولوں کو توڑ کر ان کی مہک اپنے اندر سمیٹ رہی

ہوتی..... کاش..... کاش ایسا ہوتا۔

مگر صرف کاش کہہ دینے اور محض خواہش کر لینے سے کچھ نہیں ہونے والا تھا۔ ہم اپنی خوش نصیبی اور بد نصیبی سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ زندگی کے بعض دکھ ہماری اپنی غلطیوں کا نتیجہ ضرور ہوتے ہیں، مگر بعض غم قدرت کا امتحان ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ امتحان دینا ہوتے ہیں اور درد سہنا ہوتے ہیں۔ میں بھی غم برداشت کر رہی تھی اور درد سہہ رہی تھی۔

میں سارا دن اسی بستر پر آنکھیں کھول کر اور ساری رات آنکھیں بند کر کے لیٹی رہتی۔ وقت نے اپنی رفتار بہت دھیمی کر دی تھی۔ ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کی طرح گزرنے لگا تھا۔ میری نظریں گھوم پھر کر سامنے دیوار پر لگی کھڑکی کی طرف گھوم جاتی تھیں اور بس..... اس کے سوا کچھ نہیں تھا میری زندگی میں.....

ابھی میں محض نو برس کی ہوں..... ٹھیک سے دنیا کو دیکھا بھی نہیں ہے میں نے..... مگر شاید..... میرے نصیب میں یہی لکھا ہے۔ ہم مقدر کے سکندر سے لڑ سکتے ہیں مگر مقدر سے نہیں۔

میں کینسر کی ایک مریضہ ہوں..... کینسر ایک بم ہے جو انسان کے اندر ٹک ٹک ٹک کر کے دھڑکتا رہتا ہے۔ اپنی تباہی کے دائرے کو پھیلاتا رہتا ہے۔ میرے اندر بھی کینسر کا بارود پھیل گیا ہے۔ کسی بھی وقت یہ بم پھٹ سکتا ہوں۔

میں ایک ایسی بیماری کا شکار ہوں جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ آپ کو شاید احساس بھی نہ ہوگا کہ میں کس کس چیز سے محروم ہوگئی ہوں۔ وقت..... دوست، مستی، ہلا گلا، کھیل کود، کھلونے، تعلیم..... حتیٰ کہ میں اپنے بالوں تک سے محروم ہوگئی ہوں۔ ان لوگوں نے تھراپی کے لیے میرے سارے بال کاٹ دیے ہیں۔ گنجا کر دیا تھا مجھے۔ مگر میں جس چیز سے سب سے زیادہ تکلیف میں ہوں..... وہ وقت ہے۔

بہت ظالم ہوگیا ہے وقت..... گزرتا ہی نہیں ہے۔ دن شروع ہوتا تو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ رات ہو جاتی تو رات ہی رہتی ہے..... اور اندھیرا ختم نہیں ہوتا..... دن سے زیادہ لمبی راتیں اور راتوں سے زیادہ لمبے دن ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹروں اور نرسوں کی سرگوشیوں میں گفتگو، ہسپتال کے کھانے اور ادویہ کی بو..... چند ایسی مزید چیزیں ہیں جو مجھے دھیرے دھیرے موت کی طرف لے جا رہی ہیں۔ میں ان سب سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں، مگر مجھے نہیں لگتا کہ یہ آسان کام ہے۔

میرے والدین، میرے گھر والے رشتے دار..... سارا سارا دن میرے سامنے منہ لٹکائے کھڑے رہتے ہیں۔ اپنی بے چارگی اور بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ مایوسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اپنی آنکھوں سے اُمڈتے آنسو پینے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں ان سب چیزوں سے بھی بے زار ہوگئی ہوں۔ کچھ نیا نہیں رہا اس سب کچھ میں میرے لیے..... مجھے ان سب کے دکھ کا احساس ہے۔

مگر کیا مجھ سے زیادہ دکھی ہو سکتا ہے کوئی؟ جس کو یہ اندازہ ہوگیا ہو کہ وہ بچنے والا نہیں ہے؟

تاریخ: ۱۵ مارچ

آج میری دادی مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ ملنے کیا، دیکھنے آئی تھیں مجھے۔ ان کے پاس میرے لیے سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو ہی آنسو تھے..... اور دوپٹے کا پلو بھی آنسوؤں سے بھیگتا ہی جا رہا تھا۔ میں ان آنسوؤں سے تنگ آ گئی ہوں۔ ٹھیک ہے..... شاید میں بستر مرگ پر ہوں..... مرنے والی ہوں.....

وہی زندگی..... وہی ہنستی کھیلتی زندگی جو اسپتال کے اس بیڈ سے باہر ہے۔ وہ زندگی جو میں جیتی رہی تھی۔ میرے اندر وہ ہنستی کھیلتی زندگی اب بھی موجود ہے۔

میں زندہ انسانوں کی طرح بات کرنا چاہتی ہوں۔ ماتم بہت ہوگیا، بہت رو لیے سب لوگ..... خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ، رونا بند کرو۔

کیا کوئی مجھ سے نارمل انسانوں کی طرح بات نہیں کر سکتا ہے۔ سب رونے اور رلانے کے لیے کیوں زندہ ہیں؟ میری ہمت کیوں نہیں بڑھاتے یہ لوگ؟ مجھے حوصلہ کیوں نہیں دیتے؟

سب کو رونے اور سسکنے کے علاوہ کوئی اور کام کیوں نہیں ہے؟ سب میرے سامنے مایوس اور شرمندہ دکھائی دیتے ہیں۔

''آئی ایم سوری بیٹی.....''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب لوگ کس بات پر شرمندہ ہیں؟ مجھ سے نظریں کیوں چراتے ہیں؟ مجھ سے آنکھ ملا کر، مسکرا کر بات کیوں نہیں کر سکتے؟ ٹھیک ہے..... میری حالت بہت خراب ہے۔

مگر اس میں ان کا تو کوئی قصور نہیں۔ پھر یہ اس انداز میں دکھی اور شرمندہ کیوں ہیں کہ جیسے سارا قصور ان ہی کا ہے؟ شاید..... میرے دل میں کچھ اور..... مزید جینے کی شدید ترین خواہش ہے..... مگر اس طرح جینے کی نہیں..... جس طرح یہ لوگ چاہ رہے ہیں۔ بے چارگی اور بے بسی کی زندگی..... کیا مطلب؟ سب لوگ میرا خیال رکھتے ہیں..... اتنا خیال رکھتے ہیں کہ میں تنگ آ گئی ہوں۔

مجھے یوں سنبھال رہے ہیں۔ چھو رہے ہیں جیسے میں کانچ کا کوئی نازک گلاس ہوں۔ اس کے بجائے انھیں کچھ اور کرنا چاہیے تھا۔ کم از کم اتنا تو کر سکتے تھے کہ میرے اس چھوٹے سے کمرے کو پھولوں سے بھر دیتے۔ اس کمرے کو میرے لیے ایک چھوٹا سا باغیچہ بنا دیتے۔ یا پھر..... میرے لیے اچھی اچھی کتابیں لے آتے.....

مگر نہیں..... انھیں اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہے کہ میں اپنی اس مختصر سی زندگی میں کیا چاہتی ہوں۔ کس طرح کی سوچیں سارا دن اور ساری رات مجھے گھیرے رکھتی ہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے کینسر کی پل پل مرتی مریضہ نہ سمجھا جائے۔ ایک نارمل بچہ سمجھا جائے اور اسی طرح کا سلوک کیا جائے۔

تاریخ: ۱۸ مارچ

معلوم نہیں میں کیا کیا سوچتی رہتی ہوں۔ مگر اچانک ہی میں نے اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں محسوس کی ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے اسکول کے دن گھومنے لگے ہیں۔ جیسے کوئی جادو ہو رہا ہے۔ ایک ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے آ رہا ہے، میری دوست..... میرے ٹیچرز..... گھر سے اسکول کا راستہ..... اور اسکول میں لگا ہوا وہ شہتوت کا پیڑ..... جس پر میں چڑھ جایا کرتی تھی..... کھٹے میٹھے شہتوت توڑ کر کھاتی رہتی تھی۔

میری آنکھوں کے سامنے اب سارے چہرے ایک ایک کر کے آتے ہیں، بلب کی طرح روشن ہوتے ہیں اور یوں بجھ جاتے ہیں جیسے لائٹ چلی گئی ہو۔

میں نے ایک خواب دیکھا ہے، میں نے دیکھا کہ میں ایک تاریک جنگل میں ہوں۔ میرے اردگرد تاریکی ..... اور لمبے لمبے طویل قامت درخت ہی درخت ہیں۔ میں خوف اور دہشت کے عالم میں اس جنگل میں بھٹک رہی ہوں..... کچھ ڈھونڈ رہی ہوں..... پیاس..... ہاں پیاس لگی ہے مجھے..... بہت شدید پیاس.....

میں پانی تلاش کر رہی ہوں..... جنگل میں ایک تالاب کے پاس پہنچ گئی ہوں..... مگر یہ کیا..... تالاب میں پانی نہیں ہے..... خون ہے..... خون ہی خون ہے ہر طرف..... بار بار مختلف تالابوں کی طرف جا رہی ہوں، مگر ہر تالاب خون سے لبالب بھرا ہوا ہے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے تالاب پھیلنے لگے۔ اور ہر طرف خون ہی خون ہو گیا۔ ہر چیز خون میں نہا کر سرخ ہو گئی۔ پھر گھبرا کر میں نے آنکھ کھول دی۔

بہت بھیانک خواب تھا۔ صبح ڈاکٹر کو اس کے بارے میں بتاؤں گی۔ اب تو مجھ سے سہارے سے بھی نہیں چلا جاتا..... کھڑا ہونا بھی میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ میری تھراپی کا ٹریٹمنٹ مجھے تھکا دیتا ہے۔ ہاتھ پیروں میں سے جان نکلنے لگتی ہے..... بہت درد ہوتا ہے مجھے..... بہت تکلیف برداشت کرنی پڑ رہی ہے مجھے..... جب بھی وہ بھیانک..... جان نکال دینے والا خون میرے جسم میں انجیکٹ کرتے ہیں اور مشین پمپنگ شروع کرتی ہے..... میرا رواں رواں کانپنے لگتا ہے۔ کاش..... کاش میں آسانی سے مر جاؤں.....

کل میں کہہ دوں گی ڈاکٹر سے..... کہ مجھے بہت درد ہوتا ہے..... اور درد برداشت نہیں کر سکتی میں..... مجھ

پر رحم کریں.....

تاریخ: ۲۸ مارچ

ننھی حنا کی امی اپنا کمرا بند کیے لکھنے کی میز پر بیٹھی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں قلم اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کچھ دیر تک اپنے آنسو ضبط کرتی رہیں، پھر انھوں نے لکھنا شروع کیا۔

"میری بیٹی نے مجھ سے کہا تھا امی، آپ میری کہانی ضرور لکھنا، میں اس کی کہانی لکھ رہی ہوں۔

میری بیٹی کو سفید رنگ بہت پسند تھا، وہ ہر چیز سفید لینا پسند کرتی تھی اور میں اس کو پکڑ کر گھنٹوں سفید دیوار کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھی۔ وہ دوسرے بچوں سے بالکل مختلف اور منفرد تھی..... زندگی میں چھوٹی چھوٹی چیزوں اور باتوں کی اہمیت سمجھتی تھی اور جنونی انداز میں ہر چیز کی باریکیاں پوچھتی رہتی تھی۔

اس کی ایک بات شاید آپ کو اس کے مزید قریب لے آئے..... میرا خیال ہے کہ یہ چیز اس کی زندگی کی سب سے اہم بات تھی..... ایک عجیب سی پراسرار بات ہے اس میں..... اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا سوچتی تھی..... حتیٰ کہ میں..... اس کی ماں ہوتے ہوئے بھی کبھی نہیں جان سکی کہ وہ کیا سوچتی تھی..... اگرچہ میں اس کے اور وہ میرے بہت قریب تھی، لیکن اس نے اپنے اندر ایک ایسی خفیہ دنیا بنا رکھی تھی جس کے بارے میں کبھی کسی کو کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ کوئی بھی، کبھی بھی اس کی اس ذاتی دنیا میں نہیں جھانک سکا۔ مجھے اپنی بیٹی بہت عزیز تھی۔ جیسے ہر ماں کو اپنی بیٹی عزیز ہوتی ہے..... آج جب اس کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے اپنی مختلف اور منفرد بیٹی کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی فخر محسوس ہو رہا ہے۔ حنا کی بیماری..... بیماری نہیں تھی۔ ایک جنگ تھی۔ ایسی جنگ جو وہ تن تنہا لڑتی رہی تھی۔

وہ ننھی سی تھی مگر نہایت بہادر جنگجو تھی۔ جب آخری دنوں میں اسے ہسپتال منتقل کیا گیا تو اس نے سسکتے ہوئے کہا تھا۔ "امی مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھے کسی پنجرے میں قید کر دیا گیا ہے، جیسے جانوروں کو بند کر دیا جاتا ہے۔

مجھے کبھی یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ اپنے آخری دنوں میں وہ کیا کچھ سوچتی رہی تھی۔ میں تو اس کی بیماری اور بے بسی کے ہاتھوں ادھ موئی ہو چکی تھی۔ میرے پاس اس کے لیے آنسوؤں اور دعاؤں کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ بس..... اسے دیکھتی رہتی تھی۔ دل ہی دل میں..... یا زیر لب دعائیں پڑھتی رہتی..... اور اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی میں..... لیکن میں یہ ضرور سمجھ گئی تھی کہ میری ننھی سی گڑیا..... اتنی کم عمری میں زندگی کی حقیقت کو بہت گہرائی تک سمجھ چکی ہے۔ میری ننھی گڑیا بہت سی خوبیوں کی مالک تھی۔ وہ بہت

عمدہ کامیڈین تھی اور سب کی نقلیں اتار کر پورے گھر کو ہنساتی رہی تھی۔ نقل کرتے وقت اس کی ٹائمنگ اور حس مزاح کا جواب نہیں تھا۔ ہم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

جس صبح وہ ہم سے روٹھ کر اللہ میاں جی کے پاس گئی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور بڑے آسودہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''امی میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اس دنیا میں کسی نہ کسی اہم کام کے لیے آتا ہے۔ اور میں..... شاید اپنی باتوں سے گھر والوں کو کچھ دن کے لیے خوش کرنے آئی تھی۔ اب میں بہت پرسکون ہوں۔ کیوں کہ میں نے اپنا کام ٹھیک طرح سے پورا کیا ہے۔''

اس کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے، جنہیں میں کوشش کے باوجود چھپا نہیں پا رہی تھی۔ مگر حنا بہت پرسکون ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔ وہ بڑوں کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔

''امی..... میں کچھ دنوں سے مرنے کا انتظار کر رہی تھی..... کیوں کہ میرے مرنے سے ہی میں اس درد سے نجات پا سکتی تھی۔

اس کا لہجہ بہت معصوم تھا مگر میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ یہ کہانی میں اس لیے لکھ رہی ہوں تا کہ لوگ جان جائیں کہ بلڈ کینسر میں مبتلا..... موت کی طرف بڑھتے بچے کیا سوچتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں.....

شاید کوئی ان بچوں کو بچانے کے لیے کچھ کر سکے.....!!

☆.....☆

جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء

☆ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں سب سے زیادہ فضائی حملے پاکستان کے شہر سرگودھا پر ہوئے۔

☆ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کے ۱۴ اور بھارت کے ۱۱۰ طیارے تباہ ہوئے۔

☆ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کے ۱۶۵ جب کہ بھارت کے ۴۷۵ ٹینک تباہ ہوئے۔

☆ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو ختم ہوئی۔

☆ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران انڈونیشیا نے اپنی آبدوزیں پاک بحریہ کے حوالے کر دی تھیں۔

☆ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران پاکستان کا دوست امریکا جبکہ بھارت کا روس تھا۔ امریکا نے جنگی سامان سے مدد کرنے کا وعدہ کیا لیکن جنگ ختم ہو گئی اور امریکا سے کچھ نہ آیا۔

(مرسلہ: محمد خلیل چوہدری، جہلم)

شعر بھری

بس اب پرسوں.....

بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے!
نہ کوئی بعد ازاں فاقے کرے گا
چکن کھا کر مرے گا جو مرے گا
جو گھنٹہ بھر کو مزدوری کرے گا
زرو گوہر سے اس کا گھر بھرے گا
بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے!
برے دن دور ہو جائیں گے پیارے
ترقی پاؤں چومے گی تمہارے
ہر اک ووٹر کے ہوں گے وارے نیارے
جو بل ہیں، نوٹ بن جائیں گے سارے
بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے!
بھلا اب میں کوئی جھوٹا ہوں یارو
لبِ بام آ کے یوں ہمت نہ ہارو
گزارے ہیں جہاں سر ساٹھ برس تو
یہ اڑتالیس گھنٹے بھی گزارو
بس اب پرسوں الیکشن ہو رہا ہے!

شاعر: عنایت علی خان۔ پسند: مریم منظور، راولپنڈی

☆.....☆

کلرکوں کی سبھی میزوں پہ انور
ہر اک فائل مزے سے سو رہی ہے
اگرچہ کام سارے رک گئے ہیں
مگر میٹنگ برابر ہو رہی ہے

شاعر: انور مسعود۔ پسند: عریشہ نوید حسنات، کراچی

☆.....☆

بجلی کے بل کو دیکھ کے وہ بلبلا اٹھا
نکلی جو اس کی آہ تو بجلی چلی گئی

شاعر: ضیاء الحسن ضیاء۔ پسند: عریشہ نوید حسنات، کراچی

☆.....☆

جو لغت کو توڑ مروڑ دے جو غزل کو نثر کو جوڑ دے
میں وہ بد مذاق سخن نہیں وہ جدید یا کوئی اور ہے

شاعر: خالد عرفان۔ پسند: عبداللہ خان، کراچی

☆.....☆

علم میں جھینگر سے بڑھ کر کامراں کوئی نہیں
چاٹ جاتا ہے کتابیں امتحاں کوئی نہیں

شاعر: ظریف لکھنوی۔ پسند: عزیر علی، سکھر

☆.....☆

لال بیگ ایٹونپر

معروف احمد چشتی

لال بیگوں کے ایٹونچر نے کیا گُل کھلائے.... پڑھیے اس تحریر میں

یہ بھی کوئی بات ہوئی جس کو دیکھو جوتا اٹھائے ہمیں مارنے کو دوڑ رہا ہے۔ مطلب ہم لال بیگ نہ ہوئے چھوٹے بھائی ہو گئے کہ ہوم ورک نہیں کیا تو جوتے سے مرمت کر دی۔ آخر لال بیگ کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے، مگر انسان کو یہ بات کب سمجھ میں آتی ہے۔

بندہ پوچھے بھئی کیوں پیٹتے ہو بے چارے معصوم لال بیگ کو۔ ہم نے آخر بگاڑا ہی کیا ہے آپ کا۔ خدا گواہ ہے کہ روز اول سے آج تک ہم نے کسی کو ڈنک نہیں مارا۔ ہم تو اپنی خوراک خود کاٹ کے نہیں کھا سکتے۔ آپ کو کیا کاٹیں گے۔ نہ ہی ہمارے منہ میں انسانوں کی مانند دانتوں کی بتیسی ہے جو آپ کی طرح چک مار لیں گے۔ تو پھر ہم سے کیا ڈرنا؟

لال بیگ کو مارنا تو ویسے بھی بدذوقی کی علامت ہے۔ چلیں مان لیا چھپکلی مار دی کہ زہریلی ہوتی ہے۔ چوہا مار دیا کہ دانت سے کاٹ کھاتا ہے۔ مگر ہم بے چارے لال بیگوں کو مارنے کی کیا تُک بھلا؟ بدذوقی یوں کہ دنیا جہان کے حشرات الارض جمع کر لیں، سب

سے زیادہ خوب صورت اور اٹھتا ہوا رنگ لال بیگ ہی کا نکلے گا۔ ہم تو اس قدر کلر فل ہیں کہ خوش ذوق انسان بس ٹکٹکی باندھے ہمیں دیکھتا رہے۔ مردانہ وجاہت ایسی رکھتے ہیں کہ بڑے بڑوں کی مونچھیں ہماری مونچھوں کے سامنے ہیچ ہیں۔

اوہ! اب بات سمجھ میں آئی۔ مندرجہ بالا دونوں باتیں جنھیں میں اپنی خوبیوں کے طور پر بیان کر رہا ہوں شاید یہی تو ہمارے قتلِ ناحق کی وجہ ہیں۔ وہ یوں کہ خواتین ہمارے سرخ بھڑکیلے رنگ سے جیلس ہو کر ہمیں مارتی ہوں گی اور مرد حضرات ہماری عالی شان مونچھوں سے حسد کی وجہ سے ہمیں پیٹتے ہوں گے۔ بچے یقیناً ہمیں نہیں مارنا چاہتے۔ وہ تو صرف ابو، امی کی دیکھا دیکھی ہماری جان کے دشمن ہو گئے ہیں۔

ارے بابا اس سے بڑھ کر ہماری معصومیت کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم تو انسان کے احترام میں منہ سے آواز تک نہیں نکالتے۔ آپ نے رات کی خاموشی میں کمرے کی چھت سے چمٹی چھپکلی کی گُر گُر سنی ہوگی۔ بھڑ کی بھُوں بھُوں بھی سنی ہوگی۔ مگر بتائیے کبھی ہماری کوئی آواز سنی؟

ہم لال بیگ تو آپ انسانوں کے لیے اتنے فائدہ مند ہیں کہ پاکستانی سائنس دان ڈاکٹر نوید احمد خان کے مطابق لال بیگ کی مدد سے انسانوں کے لیے شفا بخش ادویہ تیار کی جا سکتی ہیں۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ اگر ایٹمی دھماکے کے بعد کوئی جاندار زندہ رہ سکتا ہے تو وہ لال بیگ ہی ہیں۔

ان سب دلائل کے بعد تو آپ انسانوں کے پاس ہم مظلوم لال بیگوں کو مارنے کا کوئی جواز ہی نہیں بچتا ہے۔ میرے خیال میں تو انسان کو بس خواہ مخواہ دہشت گردی کا شوق ہے۔ ہم جیسے بے ضرر کیڑے پتنگوں کو ناحق مارنا دہشت گردی ہی تو ہے۔

آخر کب تک لال بیگ ظلم سہتا رہے۔ ہم نے بھی تبدیلی لانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انسانوں کے خوف سے گھُٹ گھُٹ کر مرنے کے بجائے زندگی کو زندہ دلی سے گزارنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہم نے نوجوان لال بیگوں کی ایک تنظیم بنائی ہے جس کا مقصد انسانوں کے ساتھ لکا چھپی کر کے ان کو تھوڑی دیر کے لیے ڈرانا ہے۔ یقین مانیے اتنا مزا آتا ہے کہ ہم ایک واقعہ پر ہفتوں ہنستے رہتے ہیں۔ ہم نے سوچا ہے کہ جلد یا بدیر مرنا تو ہے، کیوں نہ زندگی میں مسکراہٹ بھری جائے۔ چلیے مسکراہٹ بھرے چند واقعات آپ کو بھی سناتا ہوں۔

ہماری تنظیم کے کچھ ممبران آنٹی کنیز فاطمہ کے باورچی خانے میں چھپے رہتے ہیں۔ اُن دنوں ڈاکٹر صاحب نے کسی وجہ سے آنٹی کنیز کو چائے پینا منع کر رکھی تھی۔ مگر وہ باز نہ آتی تھیں اور دن میں ایک، دو کپ پی ہی لیتی تھیں۔ ایک رات جب سب بچے وغیرہ سو گئے تو

آنٹی کو چائے کی طلب ہوئی وہ چپکے سے اُٹھیں اور باورچی خانے کا رُخ کیا۔ پتیلی میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا دیا۔ اب بندہ پوچھے کہ آنٹی آپ دودھ پیش، دہی کھائیں تاکہ کچھ توانائی ملے۔ یہ سڑی ہوئی چائے پی کر جی جلانے کا کیا فائدہ۔ خیر پتیلی چولھے پر چڑھ چکی تو ایک مخبر لال بیگ نے آکر خبر دی کہ آنٹی چوری چھپے چائے پینے کا پروگرام رکھتی ہیں لہٰذا انھیں اس کام سے باز رکھا جانا چاہیے۔ اس طرح ایڈونچر ہو جائے گا اور آنٹی کا بھلا بھی۔ سب ممبران نے کمر کس لی۔ آنٹی نے فرج سے دودھ کی بوتل نکال کر چولھے کے قریب رکھی ہی تھی کہ ایک جانباز لال بیگ نے دوڑ لگائی اور ''زووووں'' کر کے بوتل کے پاس سے گزر گیا۔ آنٹی جی نے چیخ ماری اور چولھا جلتا چھوڑ کر کمرکی طرف بھاگیں۔ ان کے میاں نے چیخ سنی تو گھبرا کر باورچی خانے کی جانب دوڑے۔ نتیجتاً دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر بیچ برآمدے میں دھڑام سے گرے۔ بچے بھاگ کر مدد کو پہنچے۔ اور جب سب کو آنٹی کے ارادے کا علم ہوا تو انکل نے انھیں خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

کچھ ایسا ہی ملک غلام فرید صاحب کے ساتھ ہوا۔ ملک صاحب زمیندار اور سخی انسان ہیں۔ ان میں بس ایک ہی برائی ہے کہ بچوں پر سختی بہت کرتے ہیں۔ کسی بچے کی مجال نہیں کہ ان کے لان میں تھوڑی دیر کھیل کود کرلے۔ جبکہ ہم لال بیگوں کو بچوں سے پیار ہے۔ لہٰذا ایسے انسان کو مزا چکھانا تو بنتا تھا۔ شام کے بعد ملک صاحب لائٹیں جلا کر لان میں آبیٹھے۔ ان کے کچھ دوست بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوش بو میں بڑی بڑی گپیں ہانکی جا رہی تھیں۔ ایسے میں منصوبے کے مطابق ہمارے ایک ٹیم ممبر نے پر پھیلائے اور سیدھا ملک صاحب کے ہاتھ پر جا بیٹھا۔ ملک صاحب ہڑبڑا کر اُٹھے اور کپڑے جھاڑنے لگے۔ اتنے میں ٹیم کا دوسرا ممبر اُن کی میز پر جابراجمان ہوا۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اس وقت بجلی چلی گئی۔ ملک صاحب کے دوست گھبرا کر اُٹھے اور یہ کہتے ہوئے چل دیئے: ''ملک صاحب آپ کے لان میں تو کیڑے مکوڑے بہت ہیں۔ یہاں بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ خدا حافظ۔''

بے چارے ملک صاحب بھی ہمیں صلواتیں سناتے ہوئے اندر کمرے میں چلے گئے۔ ہم نے قہقہہ لگا کر کہا ''اب آیا نا مزا ملک صاحب۔ آپ بھی تو بچوں کو لان میں کھیلنے نہیں دیتے ہیں۔'' مگر ملک صاحب تک ہماری آواز شاید نہ پہنچ سکی۔

سب سے زیادہ مزا تو اس دن آیا تھا جب ہم نے ایک نک چڑھی ٹیچر کو ڈرایا تھا۔ وہ ٹیچر صاحبہ بچوں کو چپٹیاں بہت لگاتی تھیں۔ ایک دن کلاس روم میں آئیں تو سب بچوں کو شور کرنے کی وجہ سے سٹینڈ اپ

کرا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید سزا دینے کے لیے چپٹی اُٹھاتیں، ہمارا ایک ممبر بھاگ کر میز پر چڑھا اور مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا چپٹی پر بیٹھ گیا۔ ٹیچر نے جونہی چپٹی کو ہاتھ ڈالا تو چیخ مار کر پیچھے ہٹیں اور پھر ڈر کے مارے کلاس روم سے نکل گئیں۔ بچوں نے خوشی میں نعرے لگائے ''لال بیگ زندہ باد..... لال بیگ زندہ باد۔'' ہمارے ممبر نے کلاس روم پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالی اور داد سمیٹتا ہوا بھاگ گیا۔

جب شرارتیں حد سے بڑھ جائیں تو پھر سزا بھی ملتی ہے۔ یہی ہماری تنظیم کے ساتھ ہوا۔ ہماری لال بیگی شرارتوں سے تنگ آکر لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں کیڑے مار سپرے کرانا شروع کر دیا۔ اور اس طرح ہمارے بہت سے تنظیمی ساتھی ''شہیدِ شرارت'' ہوگئے۔

اب میں بھی چلتا ہوں۔ شاید آج میرے مالک مکان صاحب بھی سپرے کرانے والے ہیں۔ مگر آپ سوچیے گا ضرور کہ آخر آپ لال بیگوں سے خوف زدہ کیوں ہیں؟

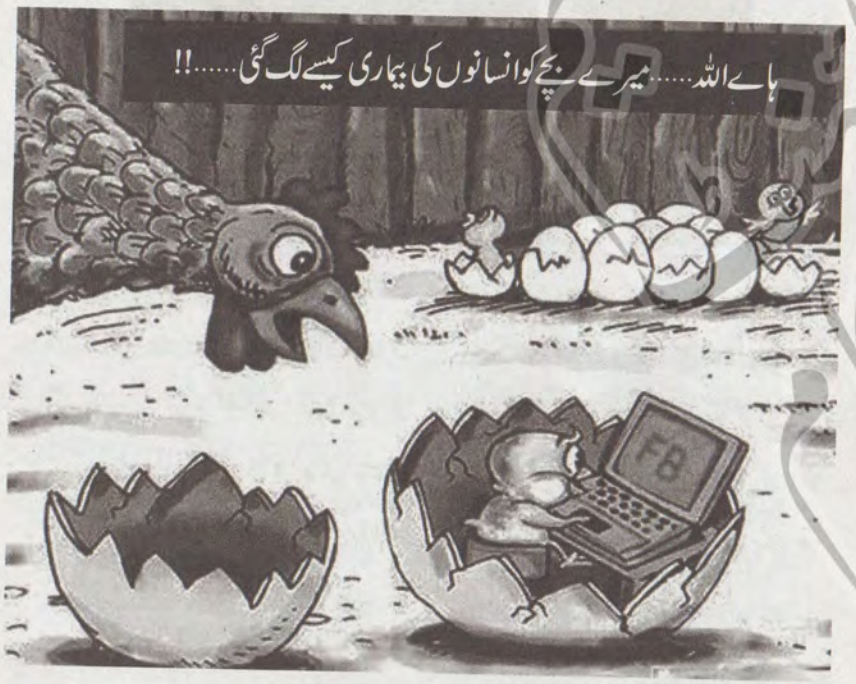

ایک تھا مٹھو

شمیم فاطمہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے، ہم نے بھی اک مٹھو پالا تھا
اس کے پنجرے کے دروازے پر اک چھوٹا تالا تھا

وہ بچارہ جانے کس طوطی کی آنکھ کا تارا تھا
جانے کس دکھیاری کا وہ مٹھو راج دلارا تھا

اس کے پنجرے کے اندر ایک آئینہ، اک جھولا تھا
ایک کٹوری کھانے کی تھی، پانی کا اک پیالا تھا

صبح سویرے اٹھ کر مٹھو اللہ! اللہ! کرتا تھا
کبھی کبھی وہ موڈ میں آ کر ہم کو نظم سناتا تھا

چوری ووری دیکھ کے مٹھو جی کا منہ بن جاتا تھا
لنچ بریک میں میرا مٹھو شوق سے پیزا کھاتا تھا

اس نے ٹیں ٹیں، ٹیں ٹیں کر کے ناک میں دم کر ڈالا تھا
مٹھو کیا تھا، اچھا خاصا آفت کا پرکالا تھا

جانے کیسے پلان بنایا تھا اس نے آزادی کا
جانے کیسے توڑ کے تالا پنجرے کا وہ بھاگا تھا

جادو کے دستانے

احمد عدنان طارق

سیمی اور بنٹی نے گورنر سے بدلہ لینے کا منصوبہ بنایا... لیکن پھر ہوا کیا؟

سیمی اور بنٹی دو بونے تھے جو بہت خوب صورت گھر میں رہتے تھے۔ جس کا نام اُنھوں نے سورج مکھی کاٹیج رکھا ہوا تھا۔ سیمی رنگ ساز تھا اور بنٹی بڑھئی۔ سیمی کسی بھی دیوار یا دروازے پر کچھ لمحوں میں خوب صورت رنگ کر سکتا تھا اور بنٹی لکڑی سے کسی دیو کے کھانے کی میز سے لے کر چڑیا کے پینے والا برتن تک بنا سکتا تھا۔

ان کے گھر کے قریب ہی ایک محل میں پرستان کا دراز ریش گورنر رہتا تھا۔ اس کی طرف سے اُنھیں ایک خط موصول ہوا۔ سیمی نے وہ خط اونچی آواز میں بنٹی کو پڑھ کر سنایا۔ سنیے! اس میں کیا لکھا تھا۔

"گورنر صاحب بہت خوش ہوں گے اگر بنٹی اور سیمی ان کے محل میں کام کرنے آئیں اور ان سے ملیں بھی۔"

بنٹی بہت خوش تھا کہنے لگا: "یہ بہت مزے کی خبر ہے۔ ہمیں کام کی بہت اچھی اُجرت ملے گی اور پھر ہم سب کو بتا بھی سکتے ہیں کہ ہم نے گورنر صاحب کے گھر میں بھی کام کیا ہے۔ تب سبھی دوست ہمارے بارے میں جان بھی لیں گے کہ ہم اچھے کاریگر ہیں۔" اگلی صبح دونوں دوست محل میں گئے۔ دراز ریش گورنر نے انھیں دیکھا تو اس نے انھیں بتایا کہ وہ کھانے کے کمرے میں رنگ کروانا چاہتا ہے اور پڑھنے والے کمرے میں اسے کتابوں کا ایک شیلف بنوانا ہے۔ ٹھیک ہے جناب اُنھوں نے کہا کہ وہ ابھی اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ پھر اُنھوں نے بڑے جوش سے کام کرنا شروع کر دیا۔

گورنر کی سیاہ بلی 'نیلو' اور سفید کتا 'شیرو' دونوں ان کے کام کو دیکھنے آئے۔ وہ دونوں ان کے سامنے آ کر بیٹھ گئے اور اُنھیں کام کرتا ہوئے دیکھنے لگے۔ سیمی ان سے اُکتا کر بولا: "یہاں سے بھاگ جاؤ تمھارے گھورنے سے ہمارے کام میں خلل پیدا ہوتا ہے۔ نیلو کہنے لگی کہ میں تو اپنے سیاہ رنگ سے اُکتا چکی ہوں۔ کاش تم میرے جسم پر پیلے رنگ کی دھاریاں بنا دو تو میں کتنی شاندار لگوں گی۔ شیرو بھی اپنے مکمل سفید

ہونے پر مایوس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم اس کی دُم رنگین کر دی جائے اُنھوں نے دونوں بونوں سے پوچھا کہ کیا کام مکمل کرنے کے بعد ان کے پاس تھوڑا بہت رنگ بچ جائے گا۔

سیمی نے کہا: ''ہوسکتا ہے لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ ہم وہ رنگ تم پر ضائع کر دیں گے تو تم غلطی پر ہو۔'' نیلو نے انھیں کہا: ''لیکن گورنر صاحب بہت خوش ہوں گے کیونکہ وہ بھی ہمارا ایک ہی رنگ دیکھ دیکھ کر اُکتا چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ تمھیں اس کام کے بدلے میں دُگنی اُجرت دے دیں۔'' بنٹی نے کہا۔

''میں اس بارے میں زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں نے سنا ضرور ہے کہ گورنر صاحب بہت کھلے دل کے ہیں۔'' لیکن پھر اُدھر سے ایک آواز آئی۔ ''نیلو، شیرو ادھر آؤ۔ تمھارا کھانا لگ گیا ہے۔'' دونوں جانور یہ آواز سن کر کھانا کھانے چلے گئے اور سیمی اور بنٹی دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ اگلے دن نیلو اور شیرو دوبارہ ان کے پاس آ گئے اور ان کے کام کو غور سے دیکھنے لگے۔ تیسرے دن سیمی نے دیوار کو انتہائی خوبصورت پیلے رنگ سے دیدہ زیب بنا دیا اور بنٹی نے انتہائی خوبصورت لکڑی کا شیلف تیار کر لیا۔ دونوں جانوران کے رنگوں کے ڈبے سونگھنے اور جھانکنے لگے۔ پھر کہنے لگے۔ ''سیمی مہربانی کر کے کچھ رنگ ہم پر خرچ کر دو کیونکہ ڈبوں میں تھوڑا سا رنگ بچا ہوا ہے۔ ہم خوش ہوں گے تو گورنر صاحب خوش ہوں گے صرف اپنا پیلا رنگ کا تھوڑا سا استعمال کر لو۔'' سیمی سخت مخمصے کی حالت میں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے یہ کام کرنا بھی چاہیے یا نہیں لیکن دونوں جانوروں نے اس کی اتنی منت کی کہ آخر کار سیمی اور بنٹی کو ان کی بات ماننی ہی پڑی۔ بنٹی نے شیرو کی دُم اور کان پیلے کر دیے اور سیمی نے کالی نیلو کے جسم پر پیلی دھاریاں بنا دیں۔ اب وہ بہت مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے حتیٰ کہ سیمی اور بنٹی بھی انہیں دیکھ کر قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن نیلو اور شیرو مطمئن تھے۔ وہ کمرے سے نکل کر بھاگے لیکن راہداری میں ان کی ملاقات گورنر صاحب سے ہوگئی۔ اُنھوں نے دونوں جانوروں کو حیرانی اور خوف سے دیکھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ان کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا یہ واقعی شیرو ہی ہے اس کے کان اور دُم پیلے کیسے ہو گئے؟ وہ سوچ رہے تھے کہ شاید ان کی آنکھوں میں کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ پھر اُنھوں نے عینک لگائی اور دوبارہ جانوروں کو غور سے دیکھنے لگے۔ پھر انھیں اچانک غصہ چڑھ گیا۔ اُنھوں نے سیمی اور بنٹی کو غصے سے آوازیں دیں اور جب وہ آ گئے تو ان سے پوچھا کہ کیا یہ حرکت ان کی ہے؟ ''تم نے میرے کتے اور بلی کا کیا حشر کر دیا ہے۔ فوراً میرے محل سے دفع ہو جاؤ۔'' اُنھوں نے سیمی اور بنٹی کو انتہائی بُرے لہجے میں ڈانٹا۔ اُنھوں نے گورنر صاحب کو لاکھ بتانے کی کوشش

کی کہ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلکہ رنگ لگوانے کے لیے دونوں جانوروں نے ان کی منتیں کی تھیں لیکن گورنر نے کہا: ''میں تمھاری بات کا یقین نہیں کرتا۔ تم نے صرف میرا مذاق اڑانے کے لیے ایسا کیا ہے۔ اب دفع ہو جاؤ اور آئندہ مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔'' سیمی نے گورنر سے التجا کی کہ اُنھوں نے اپنا کام ختم کر لیا ہے۔ مہربانی فرما کر ان کی اُجرت دے دی جائے۔ لیکن اُجرت دینے کے بجائے گورنر نے اپنے ملازموں کو بلوایا اور انھیں محل سے باہر پھنکوا دیا۔ وہ بے چارے اُٹھے اور اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے دوڑ پڑے۔ وہ تب تک دوڑتے رہے جب تک کہ سورج مکھی کا میچ میں نہیں پہنچ گئے۔ ان کے برش اور رنگ کے ڈبے بھی گورنر کے محل میں رہ گئے۔ وہ گھر میں آ کر آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''ظالم..... خودغرض گورنر۔ ہم نے اس کا کام بھی مکمل کر دیا۔ پھر بھی اس نے ہمیں پھوٹی کوڑی نہیں دی۔ وہ صرف بہانے سے ہمارے پیسے ہضم کرنا چاہتا تھا۔ کنجوس گورنر۔'' دونوں اپنی دل کی بھڑاس ایسی باتیں کر کے نکالتے رہے۔ پھر اچانک بنٹی نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا: ''ہم اس کا بدلہ لیں گے ہم اپنے دوست رازی کے پاس جاتے ہیں جو دستانے بناتا ہے کیونکہ وہ ہم سے زیادہ عقل مند ہے۔ ہمیں اسے بتانا چاہیے۔'' رازی نے جب اپنے دوستوں کو آتے دیکھا تو اپنا کام کرنا بند کر دیا اور ان کے لیے چائے کا بندوبست کرنے لگا لیکن رازی کو ایسا لگا جیسے اس کے دوست افسردہ ہیں۔ اس نے ان سے ان کی مشکل پوچھی تو چائے پیتے ہوئے سیمی اور بنٹی نے رازی کو سارا واقعہ سنایا اور اس بے عزتی کا بھی ذکر کیا کہ کس طرح گورنر نے انھیں اُجرت دینے کے بجائے اُنھیں محل سے باہر پھینکوا دیا۔

بنٹی نے رازی کو کہا کہ وہ گورنر سے بدلہ لینا چاہتے ہیں لیکن ان کے پاس کوئی ترکیب نہیں۔ رازی نے سوچتے سوچتے اپنے ناک پر انگلی رکھی اور ترکیب سوچنے لگا۔ آخر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ پھر اس نے اپنے دونوں دوستوں کو بتایا کہ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ گورنر کی سالگرہ اگلے ہفتے ہے۔ میں اسے دستانوں کی جوڑی تحفے میں بھیجوں گا۔ لیکن پتا نہیں لگنے دوں گا کہ یہ کس نے بھیجے ہیں؟ میں ان دستانوں پر جادو کا ایک ایسا منتر پڑھ دوں گا اور جیسے ہی وہ ان دستانوں کو پہنے گا اس منتر کا اثر اسی وقت شروع ہو جائے گا۔ سیمی نے مضطرب ہو کر اس منتر کو تفصیل جاننا چاہی تو رازی نے ہنستے اسے بتایا کہ جب وہ یہ دستانے ہاتھوں میں پہنے گا تو اس کے ہاتھ اسے مجبور کر دیں گے کہ جو شخص اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ہو اس کی

چٹکی کاٹ لے۔ کے مارے اور دھکے دے۔ اس کے دونوں ہاتھ دستانوں کی وجہ سے عجیب و غریب حرکات کریں گے۔ اور اسے پتا بھی نہیں لگے گا کہ یہ کیسے ہو رہا ہے؟ اس کے ہاتھ دوسرے کی ناک پر مکا ماردیں گے۔ پسلیوں میں گدگدی کریں گے اور چٹکی بھی کاٹیں گے۔ اس طرح کی حرکات دیکھنے میں بھی بہت مزا آئے گا اور پھر یہ تینوں دوست آنے والی مضحکہ خیز صورت حال کو سوچ کر ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔

☆.....☆

سارا ہفتہ رازی دستانوں پر کام کرتا رہا اور پھر بہت ہی خوبصورت دستانے تیار ہو گئے۔ وہ شوخ سے سرخ رنگ کے تھے اور ان پر پیلے بٹن لگے ہوئے تھے۔ جب سالگرہ کا دن آیا تو سیمی اور بنٹی دستانے گورنر کو بھجوا چکے تھے۔ پھر صبح صبح وہ سالگرہ کے دن ٹہلتے ٹہلتے محل کے پاس بھی چلے گئے تاکہ وہ سن سکیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ گورنر کو سالگرہ کے دن بے شمار تحائف موصول ہوئے اس نے ایک ایک کر کے تمام تحائف کھول کر دیکھے لیکن ان میں زیادہ تر اسے پسند نہیں آئے لیکن جب اس نے دستانے دیکھے تو وہ دیکھتے ہی اُسے پسند آ گئے لیکن کوشش کے باوجود اسے پتا نہیں چلا کہ یہ کس نے بھجوائے ہیں؟ پھر اس نے سوچا کہ شاید یہ پرستان کے بادشاہ نے خود اسے بھجوائے ہیں۔ میرا خیال ہے کیونکہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے یہی بات ثابت کرنے کے لیے یہ دستانے مجھے بھجوائے ہوں اگر یہ صحیح ہے تو مجھے یہ دستانے پہننے چاہییں اور بادشاہ کے پاس جانا چاہیے۔ لیکن پھر اسے پتا چلا کہ وہ باہر رتھ میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس وقت سہ پہر ہو چلی تھی۔ جب وہ بادشاہ کے پاس گیا تو اس نے اسے رتھ پر سوار کر لیا اور اسے کہنے لگا کہ دراز ریش میں تم سے امور سلطنت کے بارے میں کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں اور ساتھ ساتھ رتھ میں سیر بھی کریں گے۔ دراز ریش رتھ پر سوار ہوا تو رتھ کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس وقت سیمی، بنٹی اور رازی بھی وہیں مٹرگشت کر رہے تھے۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ گورنر بادشاہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو گیا ہے اور جادو کے دستانے بھی اس نے ہاتھوں میں پہنے ہوئے ہیں تو وہ وہیں کھڑے ہو گئے وہ سخت خوفزدہ تھے کہ بادشاہ کا یہ دستانے کیا حشر کرنے والے ہیں؟ سیمی نے بنٹی اور رازی کو کہا کہ آؤ رتھ کے ساتھ چلیں۔ وہ رتھ کے ساتھ ساتھ چھپ کر دوڑنے لگے۔

پھر وہ خاموشی سے رتھ کے پیچھے ایک بڑھی ہوئی چھوٹی سی جگہ پر بیٹھ گئے لیکن ان کے بیٹھنے کا کسی کو علم نہیں ہوا۔ گورنر نے بادشاہ کو اپنے دستانے دکھائے۔ بادشاہ نے دستانوں کی بہت تعریف کی لیکن پھر وہ حیران رہ گیا۔ کیونکہ دراز ریش کے دونوں ہاتھ بڑھے اور اُنھوں نے بادشاہ کی ناک مروڑ دی۔ پھر وہ بادشاہ کی

پسلیوں کی طرف بڑھے اور اسے گدگدی کرنے لگے۔

اوہ! بند کرو۔ بادشاہ نے نفرت سے دراز ریش کو کہا ''تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے۔'' گورنر سخت خوفزدہ تھا اور حیران بھی یہ سوچتے ہوئے کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اور اس کے ہاتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ پھر اس نے کوشش کی کہ کسی طرح وہ اپنے ہاتھ جیبوں میں ڈال لے لیکن اس کی مرضی کے بغیر اس کے ہاتھوں نے بادشاہ کے سر سے اس کا تاج گرا دیا۔ اس کے کان کھینچے اور پھر اس کے گالوں پر چٹکی لی۔ بادشاہ کا غصے سے بُرا حال تھا۔ اس نے گورنر کو جوابی چٹکی کاٹی اور اسے دھکا دیا۔ تینوں دوست ایک درز سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی خوفزدہ تھے۔ ''میرے دستانو! میرے پاس آ جاؤ۔'' رازی نے آواز دی تو دستانے فوراً اس کے پاس آ گئے۔ ادھر گورنر کے ہاتھ عجیب و غریب حرکتیں کرنے سے باز آ گئے۔ اب وہ شرمندگی سے بادشاہ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ بادشاہ نے رتھ رکوائی اور باہر اتر آیا۔ ''جو کچھ ہوا ہے مجھے اس کی تہہ تک پہنچنا ہے گورنر کیا تمھارے پاس کوئی وضاحت ہے؟''

اس نے گورنر سے پوچھا: ''بادشاہ سلامت کوئی وضاحت نہیں۔ مجھے نہیں پتا یہ کیسے ہوا ہے؟'' اس نے جواب دیا۔ مجھے امید ہے کہ شاید یہ تینوں اس بات کا کوئی جواب دیں۔ بادشاہ نے تینوں دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ جو سرخ شرمندہ چہرے لیے قریب ہی کھڑے تھے تو سیمی نے کہا کہ بادشاہ سلامت ہم بہت شرمند ہیں۔ لیکن میں آپ کو اصل واقعہ بتاتا ہوں اور پھر اس نے تمام واقعات بادشاہ کو بتائے کہ کس طرح گورنر نے ان کے ساتھ زیادتی کی یہ سن کر بادشاہ نے سختی سے گورنر کی طرف دیکھا لیکن پھر تینوں کو کہا کہ تمھیں بھی کوئی حق نہیں تھا کہ تم خود گورنر سے بدلہ لو تمھیں شکایت لے کر میرے پاس آنا چاہیے تھا۔ تم نے غلطی کی تمھیں سزا ملنی چاہیے۔ لیکن گورنر نے بھی بہت غلطی کی اسے بھی سزا ملنی چاہیے۔ اسے پہلے تمھاری اجرت تمھیں دینی چاہیے لیکن اس میں سے تمھیں آدھے پیسے سزا کے طور پر بونوں کے ہسپتال کو دینے ہوں گے۔ اور میری رتھ کو پالش کرنی ہوگی۔ جب تک کہ وہ چمکنے نہ لگ جائے۔ لہٰذا تینوں بونوں کو سارا دن رتھ چمکانی پڑی۔ اس کے بعد بادشاہ نے انھیں معاف کر دیا۔

تینوں دوست گھر آ گئے۔ انھیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی ہار ہوئی ہے یا جیت۔ سیمی نے بنٹی سے کہا کہ آئندہ کتوں بلیوں کی بالکل نہیں سننی۔ وہ اپنی شرارتیں بھی چھوڑ دیں گے۔ رازی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اگلے چھ ماہ میں وہ مشہور بھی ہو گئے اور امیر بھی۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا..... چلیں چھوڑیں یہ کہانی پھر کبھی سہی.....☆

والدین کیلئے صدقۂ جاریہ

تبدیلی کے لیے تبدیل ہونا ضروری ہے

تعمیر اخلاق پروگرام

بانی: سید معظم علی قادریؒ

- تعلیمی اداروں میں طلبہ اور طالبات کو تعلیمی، سماجی اور معاشرتی طور پر رہنمائی فراہم کرنا
- طلبہ و طالبات کو اصول صحت سے آگہی فراہم کرنا اور صحت مند عادات کی تشکیل کرنا
- گھروں اور تعلیمی اداروں کے ماحول کو خوشگوار بنا کر روزمرہ پیش آنے والے مسائل کو خوش اسلوبی کے ساتھ حل کرنے کی تربیت دینا
- مختلف اہم موضوعات پر ورکشاپس، سیمینار اور لیکچرز کا انعقاد کرنا
- اگر آپ بحیثیت والدین، سرپرست، اساتذہ، منتظم ادارہ طلبہ و طالبات کے جملہ سماجی تعلیمی طبی اور معاشرتی مسائل کے حل میں ہماری رہنمائی چاہتے ہیں تو رابطہ کیلئے رجوع فرمائیں۔

سید وزیر علی قادری (ایم کام): سینئر نائب صدر

0306-0892370
0321-2044953
0332-3411410

ای میل: csr_tap@yahoo.com / wazirqadri@yahoo.com

نوٹ ہر نماز کے بعد والدین، بانی پروگرام و چھوٹی ہمشیرہ کیلئے دعائے مغفرت کی استدعا

ایک خط جنگ کے میدان میں

اطاف حسین

۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء کا سورج اپنے دامن میں طرح طرح کے خدشات سمیٹے طلوع ہو چکا تھا۔ اس وقت کافی دُوری پر واقع بھارتی فوج کے مورچوں میں ''مصنوعی'' سکوت طاری تھا شاید دشمن نئی جنگی حکمت عملی تیار کرنے میں مصروف تھا۔ اِدھر پاکستانی مورچوں میں بھی خاموشی طاری تھی۔ پاک فوج کے افسر اور جوان اپنے اپنے مورچوں میں مستعد تھے۔ ان کی آنکھیں اردگرد کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ہر قسم کی متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پر بالکل تیار نظر آرہے تھے۔

''گرائیں!...'' سپاہی علی شان کو اچانک اپنے دائیں کندھے پر دباؤ محسوس ہوا اس نے مُڑ کر دیکھا تو عقب میں سپاہی جان محمد کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''گرائیں!...اب تم بھی کچھ دیر آرام کرلو۔'' سپاہی جان محمد کے لب ہلے۔

''نہیں یار... مجھے آرام کی ضرورت نہیں۔'' سپاہی علی

شان نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا۔

''کب تک اس طرح کھڑے رہو گے؟''

''جب تک دشمن ہمارے علاقے میں موجود ہے۔ جب تک میرے جسم میں جان ہے۔'' سپاہی علی شان کے ایک ایک لفظ سے آہنی عزم جھلک رہا تھا۔

''گرائیں !...آج جنگ شروع ہوئے کتنے دِن ہو چکے ہیں؟'' سپاہی جان محمد بولا۔

''جان محمد !.... یار مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ آج کون سا دِن ہے'' سپاہی علی شان سوچ میں گم لہجے میں بولا: ''وطن کی محبت نے سب کچھ بُھلا دیا ہے۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو.....چلو اب جگہ چھوڑو....میں ڈیوٹی سنبھالتا ہوں اور...تم زیادہ نہیں صرف تھوڑی دیر آرام کرلو'' سپاہی جان محمد نے دوبارہ پیش کش کی۔

''جان محمد!....اب ایک ہی بار آرام کروں گا۔'' سپاہی علی شان نے معنی خیز انداز میں جان محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

سپاہی جان محمد یہ پیش کش کئی بار کر چکا تھا لیکن سپاہی علی شان ہر بار آرام کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔ آج بھی اس نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن آج وہ پھر سپاہی علی شان کے عزم کے آگے ہار گیا تھا۔

☆.....☆

''گرائیں!....کیا تم بتا سکتے ہو میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں؟'' دوپہر کو سپاہی جان محمد نے مورچے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ دیر پہلے اپنی پلٹن کے ایک قریبی مورچے تک گیا تھا۔

''میں کیا بتاؤں....تم ہی بتا دو۔'' سپاہی علی شان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں....تم بتاؤ گے....اگر تمھارا جواب دُرست ہوا تو میں تمھیں انعام بھی دُوں گا۔'' سپاہی جان محمد بولا۔

''تمھارے پاس کیا ہو سکتا ہے؟'' سپاہی علی شان نچلے ہونٹ پر شہادت کی انگلی رکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

''جلدی بولو گرائیں....انعام اسی کو ملتا ہے جو سوال کا جواب فوراً دیتا ہے'' سپاہی جان محمد نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

''بتاتا ہوں....بتاتا ہوں....تھوڑا سوچنے تو دو۔''

''تین منٹ تو ہو گئے ہیں تمھیں سوچتے ہوئے اور کتنا سوچو گے؟'' سپاہی جان محمد شرارت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمھارے پاس ایک خط ہے!'' سپاہی علی شان سوچتے سوچتے اچانک بولا۔

''کس کا؟'' سپاہی جان محمد نے اس کی طرف استفساریہ انداز میں دیکھا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا لیکن سوچنے سے مجھے اتنا تو پتا چل گیا ہے تمھارے پاس خط کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔'' سپاہی علی شان اٹل لہجے میں بولا۔

''شاباش گرائیں !!....تم تو بڑے سیانے نکلے۔''

سپاہی جان محمد نے سپاہی علی شان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا اور پھر پتلون کی جیب سے ایک لفافہ اور دو پیکٹ بسکٹ نکال کر سپاہی علی شان کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

سپاہی علی شان نے لفافے پر ٹیڑھے میڑھے انداز میں لکھے پتے کو ایک نظر دیکھا اور بے اختیار مُسکرا دیا ....اس انداز تحریر کو تو وہ لاکھوں تحریروں میں پہچان سکتا تھا۔

''جان محمد !....میرے بیٹے نے مجھے خط لکھا ہے'' وہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولا ''میں اسے پڑھنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ہاں....کیوں نہیں....میں پوزیشن سنبھالتا ہوں ....اور تم آرام سے بیٹھ کر خط پڑھو'' سپاہی جان محمد نے مشین گن کے پیچھے کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔

سپاہی علی شان نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے جلدی جلدی لفافہ کھولا...اور خط نکالا اور نیچے بیٹھنے کے بجائے سپاہی جان محمد کے قریب کھڑا ہو کر خط پڑھنے لگا۔

''میرے وطن کے صف شکن مجاہد!!'' خط کی پہلی سطر پڑھتے ہی اس کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی۔ اس کے بیٹے نے اسے ایک نئے لقب سے مخاطب کیا تھا جو حیران کُن ہونے کے ساتھ ساتھ ولولہ انگیز بھی تھا۔ اس کے بعد لکھا تھا ''مجھے امید ہے کہ آپ اپنے ساتھیوں سمیت اللہ تعالیٰ کی حفظ وامان میں ہوں گے۔ ہم سب بھی خیریت سے ہیں اور اپنے مجاہدوں کی کامیابی کے لیے دُعا کرتے ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ آپ مُلک وقوم کی عزت کی خاطر لڑ رہے ہیں.....کل گڑیا اپنی سہیلیوں سے کہہ رہی تھی کہ میرے بابا دشمن سے لڑنے گئے ہیں۔ میں نے رات خواب میں دیکھا کہ میرے بابا جان نے ایک مقابلے کے دوران دشمن کے بہت سارے سپاہیوں کو اکیلے ہی ختم کر دیا۔ اس کے بعد دھواں چھا گیا اور میرے بابا اس دھوئیں میں گم ہو گئے میں انھیں ڈھونڈ رہی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

دادا جان اور دادی جان ہمارے گھر آئے ہوئے ہیں۔ دادا جان ہمیں روزانہ اخبار سے جنگ کا احوال پڑھ کر سناتے ہیں۔ اخبار تو میں بھی پڑھ لیتا ہوں لیکن دادا جان کے کیا کہنے....وہ تو جنگ کی خبریں اس انداز سے سناتے ہیں جیسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہے ہیں اور اِدھر خبریں سننے والا بھی تصور ہی تصور میں میدانِ جنگ میں پہنچ جاتا ہے۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا ''دادا جان! میرے بابا اس وقت کس محاذ پر لڑ رہے ہیں؟'' تو جواباً فخر سے سینہ تان کر بولے: ''میرا بچہ اس وقت ہر محاذ پر لڑ رہا ہے...سارے سپاہی میرے بچّوں کی طرح ہیں'' یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں اور پھر فوراً مسکرا

کر بولے: ”بیٹے!... یہ آنسو خوشی کے ہیں تم کچھ اور نہ سمجھ لینا اس وقت ہر اس باپ کی یہی کیفیت ہے جس کا بیٹا محاذ جنگ پر دشمن سے لڑ رہا ہے۔“

دادی جان اور امی جان بھی دوسروں کے سامنے فخر سے آپ کا ذکر کرتی ہیں۔ یہ تو تھیں گھر کی باتیں۔ اب میں بھی آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں .... بابا جان!... میرا دل چاہتا ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے کھولوں تو بڑا ہو جاؤں ... بالکل آپ جتنا ...اور پھر میں بھی اس دشمن سے لڑوں جس نے ہماری سرحدوں پر سر اُٹھانے کی حماقت کی ہے ...افسوس کہ میں اتنی جلدی بڑا نہیں ہو سکتا ...مجھے خوشی ہے کہ میری یہ خواہش آپ کی صورت میں پُوری ہو رہی ہے۔ آپ لڑ رہے ہیں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ کے رُوپ میں دشمن سے لڑ رہا ہوں.... میں نے آپ کو صف شکن مجاہد لکھا ہے.... صف شکن کہلانے والے مجاہد میدانِ جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے جان تو دے دیتے ہیں لیکن پیچھے نہیں ہٹتے۔ ان کی گردن کٹ تو سکتی ہے لیکن در باطل پر جھکتی نہیں ہے ....وہ کبھی امانت میں خیانت نہیں کرتے ....جو فرض ان پر عائد ہوتا ہے وہ اسے ایک قرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں .....آپ میری باتوں کا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟.... پوری قوم کی دُعائیں ہر قدم پر آپ کی ہمسفر ہیں ....اس دشمن کا سر کچل کر رکھ دیں جو پاکستان کا

محبت

پہلا دوست (دوسرے دوست سے): ”کیا تمھیں جانوروں اور پرندوں سے محبت ہے؟“

دوسرا دوست: ”جی ہاں، خاص طور پر بُھنے ہوئے مرغ سے۔“

مرسلہ: محمد عمر بن عبدالرشید، کراچی

☆.....☆

وجود مٹانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان شاء اللہ فتح ہماری ہوگی ....ذلت آمیز شکست بالآخر دشمن کا مقدر ٹھہرے گی۔

ہم سب کی طرف سے آپ اور آپ کے ساتھیوں کو سلام! اگر وقت ملے تو خط کا جواب دیجیے گا۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

والسلام

آپ کا بیٹا

علی دلاور

سپاہی علی شان نے خط کو ایک بار پڑھا....دوسری بار ....تیسری بار...اور پھر کئی بار پڑھا.... ہر بار اسے خط پڑھنے میں ایک نیا لطف آیا....ایک نئی خوشی محسوس ہوئی .....جس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہ تھا .....سپاہی علی شان کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ خط اس کے بیٹے نے پُوری قوم کے ساتھ مل کر لکھا ہے۔

☆.....☆

ہزاروں خواہشیں ایسی

شمن عمران

”بھیا آ آ آ..... مجھے نہیں پتا مجھے پاپ کارن کا پیکٹ لا کر دیں۔“ عریشہ نے ایک بار پھر ضد پکڑ لی تھی۔

”گڑیا! ابھی آپ کے بھیا کو اسکول کا بہت سا ہوم ورک ملا ہے ناں تو وہ ہوم ورک مکمل کر کے لا دیں گے۔“ عریشہ کی امی نے احسن کو ہوم ورک کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

”تو پھر حسان بھیا سے منگوا دیں ناں اور جنید بھائی تو کچھ لا کر ہی نہیں دیتے۔“ عریشہ نے گویا پاپ کارن کھا کر دم لینا تھا۔

”بھئی احسن لا دو، حسان اور جنید کرکٹ کھیلنے گئے ہیں اور عمر اور رحمان اسکول میں ہیں۔“ امی کو آخر ہار ماننا پڑی اور احسن اپنا ہوم ورک چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆.....☆

عریشہ گھر بھر کی لاڈلی تھی اور کیوں نہ ہوتی چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن جو تھی۔ اس کی خواہش پوری کرنا، پورا گھر گویا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

☆.....☆

”ارے یہ اتنا خوب صورت قلم کہاں سے خریدا؟“ عریشہ نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر نیہا کے ہاتھوں میں موجود سنہری قلم کے دیکھتے ہوئے کہا۔ نیہا نے عریشہ کی آنکھوں میں بے پناہ دلچسپی دیکھ لی تھی۔

”یہ میرے بھیا انڈونیشیا سے لے کر آئے ہیں بہت منہگا ہے۔“ نیہا نے گردن اکڑا کر کہا اور عریشہ سوچوں میں گم ہوگئی۔

☆.....☆

”بھیا آ آ، احسن بھیا، حسان بھیا، رحمان بھائی، ارے جنید

بھائی ارے کہاں ہیں آپ سب امی جان، ابو.....'' عریشہ نے آتے ہی پورا گھر سر پر اٹھالیا.....

''کیا ہوا میری جان۔'' امی بوکھلائی ہوئی آئیں۔

''امی وہ پتا ہے نیہا کے پاس کتنا خوب صورت قلم ہے اور وہ اس کے بھیا انڈونیشیا سے لائے ہیں۔ احسن بھیا آپ بھی جلدی سے لے آئیں اور ہاں زیادہ پیسے لے کر جایئے گا وہ سنہری قلم بہت منہگا ہے۔'' عریشہ نے ایسے کہا گویا انڈونیشیا گھر کے باہر بازار میں ہی موجود ہو۔

''میری گڑیا! انڈونیشیا بہت دور ہے اور پھر آپ کے ابو نے آپ کو اتنے سارے جو قلم دلا رکھے ہیں۔'' امی جان نے اسے آہستہ سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن امی وہ بہت خوب صورت ہے۔'' عریشہ نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر آخر ضد پکڑ لی۔

☆.....☆

امی آپ ہی بتائیں میں کیا کروں عریشہ نے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے اپنے کمرے میں بند ہے۔ اسے انڈونیشیا کا قلم کہاں سے لا کر دیں؟ ہم سب اسے منا منا کے تھک چکے ہیں..... بیگم یامین نے اپنی ساس کو فون پر عریشہ کے بارے میں بتایا۔

''تم فکر نہ کرو، میں اگلی ہی فلائٹ سے پہنچ رہی ہوں اپنی گڑیا کے پاس۔''

☆.....☆

''میری جان میری بھی بات نہیں مانے گی۔'' دادی جان عریشہ کا کمرہ کھلوانے میں کامیاب ہوگئی تھیں اور اب اس کے سرہانے بیٹھی۔ اسے سمجھا رہی تھیں۔ مگر اب بھی عریشہ منہ پھلا کر بیٹھی تھی۔ یہ اس کی ایسی پہلی خواہش تھی جو ۲۴ گھنٹے گزر جانے پر بھی پوری نہ ہوئی تھی۔

''میری جان آپ ہی بتائیں ایک قلم کے لیے انڈونیشیا جایا جائے اور پھر تو آپ سمجھدار ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ انڈونیشیا کتنی دور ہے؟''

''اور بیٹا اولاد ایک آزمائش ہوتی ہے۔''

''ہائیں دادو میں سمجھی نہیں۔''

''گڑیا ہاں یہی بات ہے آسان معنوں میں ماں باپ اولاد کی ہر جائز خواہش پوری کرتے ہیں۔ اب تم اپنے ماں باپ کو کون کون سے امتحان میں ڈالو گی۔ ماں باپ سے صرف وہی خواہش کرو جسے وہ پورا کر سکیں۔ تمھارے ابو صرف تم لوگوں کے لیے ہی تو کماتے ہیں۔ اور تمھاری امی تمھارا کتنا خیال کرتی ہیں۔ اب دیکھو ناں رات سے تمھارے ابو نے کچھ نہیں کھایا۔ جب میری گڑیا بھوکی ہے تو

میں کیوں کھاؤں کھانا؟'' دادی نے عریشہ کو مکمل طور پر سمجھاتے ہوئے کہا اور عریشہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ وہ کچن کی طرف دوڑی کیونکہ ابھی اسے اپنے ابو کے ساتھ مل کر کھانا جو کھانا تھا اور گھر والوں سے اپنے غلط رویے کی معافی بھی مانگنی تھی۔

☆.....☆

مصعب میاں کا دانت

ردا فاطمہ

''نہیں نہیں نہیں! میں نہیں جاؤں گا کسی ڈاکٹر کے پاس۔'' آنسوؤں کی بارش کے ساتھ مصعب میاں زور زور سے چلا رہے تھے۔

ابو جان جو کچھ دیر پہلے مصعب کو سمجھا رہے تھے کہ اپنے کیڑے لگے دانت، ڈاکٹر کو دکھا آئے۔ اب مصعب کو چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

''اچھا بھئی! نہیں جا رہے، تم چپ کرو خدا کے لیے۔'' ابو جان نے ہاتھ جوڑ کر مصعب میاں سے التجا کی۔

''ایسے نہیں جاتا تو کوئی بات نہیں! آپ ٹانگیں پکڑیں اور میں ہاتھ۔'' ثاقب بھائی نے شرارت بھرے انداز میں ابو کو مشورہ دیا۔

خطرے کے پیش نظر مصعب میاں کی بھوں بھوں مزید تیز ہوگئی اور وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگے۔ ''میں نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا میں۔'' جاتے جاتے مصعب میاں اپنا حتمی فیصلہ سنا گئے۔

''کیوں تنگ کر رکھا ہے میرے بیٹے کو۔'' امی جان نے ناراضی سے ابو اور ثاقب بھائی کو گھورا۔

''چار دن سے دانت کا درد لیے بیٹھے ہیں، لیکن اپنے دانت سے اس قدر عشق رکھتے ہیں کہ کسی ڈاکٹر کو دکھانا بھی پسند نہیں کرتے۔'' ابو نے غصے سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں، اور یہ جا وہ جا۔

☆.....☆

مصعب میاں کے دانت کی وجہ سے سب ہی پریشان تھے لیکن اس کی ضد کے آگے مجبور بھی۔ تقریباً چار، پانچ دنوں سے مصعب میاں کو نچلے دانت میں درد ہونے لگا تھا جسے پہلے ہی کیڑا لگا تھا۔ اب لاکھ سمجھانے بجھانے کے بعد بھی مصعب میاں کے پلے یہ بات نہ پڑتی تھی کہ یہ دانت دوبارہ نکل آئے گا اور درد بھی نہیں ہوگا، لیکن اس وقت اس کالے کلوٹے دانت کو نکلوالیں۔ مگر وہ تو کسی کی بات سننے کو تیار ہی نہ تھے۔

☆.....☆

''دروازہ کھولو بیٹا! کھانا کھالو۔'' امی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے مصعب کو آواز دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور بھرائی ہوئی آواز میں مصعب نے اپنا پسندیدہ جملہ دھرایا۔ ''میں نہیں جاؤں گا۔'' اور ساتھ ہی ٹپ ٹپ آنسو برسنے لگے۔

''نہیں نہیں ہم کہیں نہیں لے جا رہے تمھیں، آؤ کھانا کھالو۔ امی جان نے شفقت سے مصعب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

امی جان نے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کر بڑے احتیاط

سے مصعب میاں کو کھلائے تاکہ انھیں دانت میں زیادہ تکلیف نہ ہو۔ رات ہوئی تو وہی رونا دھونا شروع ہوگیا۔

''میرے دانت میں درد ہے۔ یہاں نہیں امی یہاں یہاں۔'' امی بیچاری ساری رات مصعب میاں کی تسلی کے لیے دعائیں پڑھ پڑھ کر مصعب پر پھونکتی رہیں اور ساتھ ساتھ تمام دیسی ٹوٹکے بھی آزماتی رہیں۔

☆.....☆

''آئیں مصعب میاں آئسکریم کھانے چلتے ہیں۔'' ابو جان نے مصعب کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''کیا! آئسکریم، یمی!! میں تو چاکلیٹ والی کھاؤں گا۔'' آئسکریم کھلانے کی پیشکش پر مصعب میاں خوشی سے اُچھلنے لگے۔ ابو جان نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور مصعب کو چلنے کا اشارہ کیا۔

''میں بھی چلتا ہوں ابو جی، مدد کردوں گا مصعب کی۔'' آئسکریم کھانے میں'' بھائی جان آہستہ سے مسکرائے۔

''ٹھیک ہے تم بھی آجاؤ۔''

☆.....☆

''چلو بھئی جلدی جلدی ختم کرو اپنی آئسکریم۔'' ابو جان نے دونوں بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چلیں گھر چلتے ہیں..... مجھ سے نہیں کھائی جا رہی۔'' مصعب میاں رونی صورت بنا کر اٹھتے ہوئے بولے۔

''ہوں!! اسی لیے تو میں ساتھ آیا تھا لاؤ ختم کروں۔'' اور پھر دو منٹ میں ثاقب بھائی مصعب کی آئسکریم پر بھی ہاتھ صاف کر چکے تھے۔ ابو جان نے ادائی کی اور تینوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''ابو آپ بھول گئے کیا۔'' ہم تو اس طرف سے آئے تھے، جہاں وہ ایک بڑا سا برگد والا سائن بورڈ لگا تھا۔'' مصعب نے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہو! چپ کرو بھئی، تمھیں کیا لگتا ہے ہم تمھیں اغوا کر کے لے جا رہے ہیں۔'' ثاقب بھائی نے آگے جھک کر مصعب کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' مصعب میاں نے اردگرد نظر دوڑاتے ہوئے بے خیالی میں کہا۔

☆.....☆

''منھ کھولیں۔'' ڈاکٹر صاحب اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر مصعب میاں کے سامنے کھڑے تھے۔ مصعب نے ایک نظر ثاقب بھائی پر ڈالی اور پھر ابو سے رحم کی التجا کی لیکن دونوں نے ہی کندھے اُچکا دیے۔ اس وقت مصعب میاں کو ان دونوں پر سخت غصہ آرہا تھا جو آئسکریم کھلانے کے بہانے انھیں کھینچ کھینچ کر ہسپتال کی سیڑھیوں سے اوپر لائے تھے۔ خیر اب مصعب میاں چاروں طرف سے گھیرے میں تھے اور منھ کھولنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب

بھی دانت کے دیدار کے لیے بڑے بے تاب نظر آرہے تھے۔

''آ آ آ'' مصعب میاں نے آخر منھ کھول ہی دیا۔ تھوڑی دیر معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مژدہ سنایا۔

''کوئی مسئلے کی بات نہیں، یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

''براہ مہربانی دائیں ہاتھ سے ہی کھیلیے گا۔'' ثاقب بھائی نے لقمہ دیا۔ پھر حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مصعب میاں کو دوبارہ منھ کھولنا پڑا۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد مصعب میاں کا کالا کلوٹا دانت ان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ بقول ثاقت بھائی کے اس وقت مصعب میاں اپنے دانت کو دیکھ کر تقدس واحترام سے جھکے جاتے تھے۔ واپسی پر ثاقب بھائی کے لاکھ چڑانے کے باوجود مصعب میاں نے منھ نہ کھولا۔ شاید انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں دوبارہ منھ کھولنے سے ان کی بتیسی ہی باہر نہ آجائے۔

گھر پہنچ کر جب امی جان کو یہ خوشخبری سنائی گئی تو اُنھوں نے بڑے پیار سے مصعب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''میرا بیٹا تو مجاہد ہے، ایسی چھوٹی موٹی چیزوں سے تھوڑی ڈرتا ہے، ابھی دیکھنا دو دن میں نیا سفید سفید دانت نکل آئے گا۔''

''ہاں ہاں مجاہد ہے، جسے میدانِ جنگ میں بڑی مشکل سے دھکے دے کر لے جایا گیا تھا۔'' ثاقب بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آج سے میں روز برش کروں گا'' آخر کار مصعب میاں نے اپنی خاموشی توڑ ہی دی۔

''شکر ہے! ڈاکٹر صاحب کی نصیحتیں رنگ لائیں۔'' امی، ابو اور ثاقب بھیا تینوں مسکرانے لگے۔

☆.....☆

ٹریفک نامہ

بلال سہیل

ٹریفک کیا ہے؟ ٹریفک سے مراد ہر وہ چیز ہے جو سڑک پر چلتی نظر آئے۔ (ارے بھئی پریشان نہ ہوں، ہم جانوروں کی بات نہیں کر رہے) ٹریفک کا نام ذہن میں آتے ہی سب سے پہلے گاڑیوں کا نام ذہن میں آتا ہے۔ اسی لیے ہم سب سے پہلے گاڑیوں کے بارے میں ہی بات کریں گے۔

گاڑیوں کے آج کل نت نئے ماڈلز آرہے ہیں۔ ایک صاحب نئے ماڈل کی کار لے کر آئے، تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ اس گاڑی کا دوسرا نیا ماڈل مارکیٹ میں آچکا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تک جو گردن اُکڑائے پھر رہے تھے۔ سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ (ظاہری بات ہے بھئی غرور کا سر نیچا) کار خریدتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کار زیرو میٹر ہونی چاہیے۔ ارے منھ کیوں بن گیا۔ آپ یہی کہیں گے کہ بہت منہگی ہوتی ہے۔ ہم آپ کو زیرو میٹر کار خریدنے کا سستا اور آسان نسخہ بتاتے ہیں۔ ارے بھئی حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی گاڑیوں کی کباڑی مارکیٹ میں

جا کر ایسی گاڑی تلاش کریں جو آپ کو دور قائد کی یاد دلا دے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو شرپسند عناصر کی مہربانی سے کوئی نئی گاڑی بھی اسی حالت میں مل جائے۔ دور قائد کی گاڑی کی تو سیٹیں بھی نہ ہوں، سیٹیں نہیں ہوں گی تو میٹر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میٹر نہ ہوا تو ہوئی نہ زیرو میٹر کار۔ اب آپ کہیں گے کہ یہ تو No میٹر کار ہوگئی۔ تو بھائی صاحب زیرو کا مطلب بھی کچھ نہیں اور No کا مطلب بھی کچھ نہیں، اب آپ کی مرضی آپ اسے زیرو میٹر کار کہیں یا No میٹر کار کہیں۔

اب ذرا ذکر ہوجائے بس کا۔ بس کا نام سنتے ہی ننھے منے بچوں کو جھولوں کی یاد آجاتی ہے۔ نوجوان لوگوں کو شور شرابے، دھوئیں اور خوشبودار پسینے میں ڈوبے ہوئے افراد سے بھرا ماحول یاد آجاتا ہے۔ بوڑھے افراد کے سامنے ذرا بس کا ذکر چھیڑیے پھر دیکھیے وہ منٹ بھر میں بسوں کے ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں کی کیسی شاندار تعریف پیش کرتے ہیں۔ نجانے لکھاری حضرات اپنے حسن تحریر پر اتنا اِتراتے کیوں ہیں۔ اگر وہ اپنی تحریر کو ڈرائیور حضرات کی تحریر سے ملا کر دیکھیں تو ان کی کاوشیں دُم دبا کر بھاگتی نظر آئیں۔ مثلاً جب نئی نویلی بس اسٹینڈ پر آکر کھڑی ہوتی ہے تو اس کے ماتھے پر لکھا نظر آتا ہے۔ ''دیکھ ٹور چکوری دی'' تھوڑے دن گزرنے پر جب بس صاحبہ کا حسن مبارک ذرا مدھم پڑ جاتا ہے تو بس کی پیشانی پر لکھا نظر آتا ہے ''ہارن مار کر پاس کرو'' چونکہ حسن مبارک ذرا ماند پڑ چکا اس لیے بے چاری ذرا سیریس ہوگئی ہیں۔ تھوڑے دن اور گزرنے دیجیے، جب ''نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت'' والا معاملہ ہوجائے تو پچھلے الفاظ غائب ہوجاتے ہیں اور ان کی جگہ لکھا نظر آتا ہے۔ ''پاس کریا برداشت کر۔'' جب معاملہ حد سے گزر جائے یعنی حالت بالکل پتلی ہوجائے تو بس صاحبہ کے ماتھے پر لکھا نظر آتا ہے ''نہ چھیڑ ملنگاں'' اس میں قہقہہ لگانے کی کوئی بات نہیں اپنا والیوم ذرا نیچا کرلیں اور بس صاحبہ سے اپنا والیوم ملانے کی کوشش نہ کریں کیونکہ بس صاحبہ جیسا والیوم آپ کے پاس کہاں؟ مثلاً کسی بس سروس نے دیوار پر اپنا اشتہار لکھا: ''ہم اپنے صارفین کی خدمت کے لیے دن رات کوشاں رہتے ہیں۔'' اس کے نیچے کسی عقلمند نے لکھ مارا ''اور ساری رات اپنی 'پاں پاں' سے شہر والوں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ لوگ بلاوجہ مچھروں کا رونا روتے رہتے ہیں۔ بھلا مچھروں کی 'پیں پیں' کا بس کی 'پاں پاں' سے کیا مقابلہ۔ اگر آپ کو بھی زیادہ سونے کا مرض ہے تو اپنا گھر بدل لیے اور مین روڈ پر گھر

لے لیجیے۔ اگر تھوڑے ہی دن میں آپ ساری رات جاگنے کے عادی نہ ہوئے تو اپنے گھر کے ساتھ ساتھ ہمارا نام بھی بدل دیجیے گا۔ اب ذرا بات ہوجائے آج کل کی نئی سواری 'چنگ چی' کی۔

چنگ چی وہ سواری ہے جسے آگے سے تو 'ہونڈا' کمپنی نے بنایا ہے مگر پیچھے سے 'سچل آٹوز' نے بنایا ہے۔ تین پہیوں پر چلنے والی اس رکشہ نما سواری میں چھت پر بٹھانے کی سہولت بھی موجود ہے۔ اس سواری کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اگر پچھلی طرف وزن زیادہ ہوجائے اور اگلی طرف کم ہوجائے تو یہ صاحبہ ہر کھڈے پر اٹھک بیٹھک بھی کرتی ہے۔ اب اگر ٹریفک کی بات ہو رہی ہو اور ٹرک کا ذکر نہ ہو تو یہ ناانصافی ہوگی۔

ٹرک صاحب ڈیل ڈول میں بس صاحبہ سے بھی بڑے ہیں۔ چونکہ ٹرک میں ڈرائیور حضرات کی سیٹ کافی اونچائی پر واقع ہوتی ہے، اس لیے ڈرائیور جناب کو صرف سامنے کا منظر نظر آرہا ہوتا ہے اور نیچے کے منظر سے وہ بالکل لاعلم ہوتے ہیں۔ جب بھی کوئی بندہ ٹرک کی زد میں آجاتا ہے تو ٹرک ڈرائیور ان بے فکری سے ٹرک چلاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ انھیں کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ مگر پھر لوگوں کی چیخ و پکار انھیں نیچے کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کردیتی ہے۔ اب ہم بات کریں گے ٹریفک جام میں سب سے اہم کردار ادا کرنے والی سواری گدھا گاڑی کی۔

سب سے پہلے ہم اس بات کی وضاحت کریں گے کہ گدھا گاڑی صاحبہ ٹریفک جام کرنے میں سب سے اہم کردار کیسے ادا کرتی ہیں۔ جب یہ کوئی مڑنے کے بعد بیچ سڑک پر آجاتی ہے اور عین اسی وقت جناب گدھا صاحب چلنے سے انکار کردیتے ہیں تو ٹریفک تو ظاہری بات ہے جام ہوگا۔ یہ وہ سواری ہے جسے آگے سے قدرت نے بنایا ہے اور پیچھے سے انسان نے بنایا ہے۔ یہ اپنے مشہور و معروف نام 'کھوتا کرولا' کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ ہم نے کبھی اس سواری کی سواری نہیں کی، جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے، اسی لیے ان کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں بتا سکتے۔ ہاں بس اتنا بتا سکتے ہیں کہ اس کے انجن میں کیسے 'ڈھینچوں ڈھینچوں' کی آواز آتی ہے۔ اچھا جی، اب ہم اپنا یہ ٹریفک نامہ ختم کرتے ہیں آئندہ کے لیے..... خدا حافظ۔

☆.....☆

راستہ

دو افراد جن کے درمیان کچھ رنجش تھی ایک ایسی گلی میں آمنے سامنے آگئے۔ جہاں دونوں اکٹھے نہیں گزر سکتے تھے۔ اب کچھ دیر تو وہ کھڑے رہے۔

آخر ایک صاحب بولے: ''میں گدھوں کو راستہ نہیں دیا کرتا۔''

یہ سن کر دوسرے صاحب مسکراتے ہوئے ایک طرف ہوگئے اور کہا: ''میں دے دیا کرتا ہوں۔''

مرسلہ: تحسین احمد، لاہور

خط.....رے

جہان آباد سے ناہید ضمیر حسین ہمارے درمیان تشریف فرما ہیں.....

ساتھی کا ہر شمارہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ مجھے ساتھی بہت پسند ہے۔ کہانی بہت ہی اچھی ہوتی ہے۔ کہانیوں میں 'منافع اسکیم'، 'میں ہوں ہرنوٹا'، 'پینگلز کا راز'، 'گلاب کی کہانی' بہت اچھی لگیں جبکہ نظموں میں 'میں کچھ بھی کہہ نہ پایا'، 'چوزے'، 'منے کی شرارت'، 'اُخوت کا نغمہ' دل کو بھایا۔

عریشہ بنت حبیب الرحمٰن رقم طراز ہیں

جولائی کے سرورق پر انکل مچھیرے مچھلیاں دیکھ کر اتنے خوش ہوئے کہ پانی میں ہی کود پڑے لیکن ایک پاؤں پانی میں ڈال کر اور ایک باہر پتھر پر رکھ کر وہ یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ وہ اندر نہیں جانا چاہتے ہیں بلکہ خوشی میں دیوانے ہو گئے ہیں۔ ان کی اس حرکت پر پاس کھڑی مچھلیاں بھی حیرت زدہ ان کو دیکھ رہی ہیں۔ 'دل پہ دستک' اس دفعہ دلچسپ اور اثر انگیز تھی۔ لگتا ہے آئیڈیا نمبر کے اثرات اب تک اختتام پذیر نہیں ہوئے۔ 'منافع اسکیم' ایک بہترین تحریر تھی۔ نظم 'منے کی شرارت' میں منے کی تصویر منے کی نہیں بلکہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ 'نظر نہ

آنے والا پیغام' معلومات سے بھرپور تھا۔ 'میں ہوں..... ہرنوٹا' ماں کے پیار کی اہمیت اجاگر کرتی ایک حسین تحریر تھی۔ اہم بات واقعی اہم اور قابل غور بات تھی۔ 'ذرا کھلکھلائیے' اس دفعہ کچھ خاص نہیں تھا۔ 'آئیڈیا نمبر ۷' کا موضوع بہت اہم تھا۔ 'برف کا کیڑا' پڑھ کر بہت حیرت ہوئی۔ 'میں کچھ کہہ نہ پایا' پڑھ کر بچارے گھوڑے پر بہت ترس آیا۔ 'پینگلز کا راز' کا اختتام بہت پسند آیا۔ 'عظیم بھائی کی عظیم بہن' اور 'سرکل' کہانی اور 'میں چھوڑو نہیں ہوں' اچھی لگیں۔ 'اُف یہ کہانی' جناب سے کئی بار واسطہ پڑ چکا ہے۔ لیکن نام نہیں پتا تھا۔ اب پتا چل گیا۔ 'آپ کی تخلیق' میں جدید آدمی کچھ عجیب سا لگا۔ خطرے میں لگتا ہے نورین ایمان نے اشتیاق احمد کی دو باتیں زیادہ پڑھ لی ہیں۔ اسی لیے اب وہ بھی دو باتیں کرنے لگی ہیں۔

مینہ حفیظ کو ساتھی میں خوش آمدید کہتے ہیں

دل پہ دستک زبردست تھا۔ اس سے معلوم ہوا ہمارے والدین ہم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ کہانیوں میں 'منافع اسکیم' زبردست تھی اور سمجھ بھی آئی۔ 'میں ہرنوٹا' بہت اچھی تھی۔ آئیڈیا نمبر ۷ کچھ کچھ سمجھ نہیں آئی۔ 'پینگلز کا راز' واہ کیا بات ہے فاران کی۔ 'میں چھوڑو نہیں ہوں' بچوں کے حساب سے اچھی تھی۔ 'چھوٹا روزہ' 'عنانیر کی آئیر گن' 'اُف یہ کہانی' 'بچارے مرغے میاں' اچھی تھی۔ 'ذرا کھلکھلائیے' ہمیشہ کی طرح ساتھی کی جان ہے۔ نظموں میں کچھ کہہ نہ پایا' پر رونا آ گیا۔ 'قصہ جنگ بدر' اچھی تھی۔

ساتھی کے نئے ساتھی بلال سہیل کچھ کھٹی اور میٹھی باتیں کرنا چاہ رہے ہیں

ضیاء اللہ محسن صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ قلکار بھی بنتے جا رہے ہیں۔ (وہ پہلے سے قلکار ہیں) 'منافع اسکیم' اچھی تھی لیکن پہلے نمبر پر 'سرکل' (علی اکمل تصور) تھی۔ 'پینگلز کا راز' کی پہلی قسط سے لگ رہا تھا کہ کہانی بہت اچھی ہوگی، لیکن یہ تو عام سی کہانی ثابت ہوئی۔ تیسرے نمبر پر 'پناہ' (وقار محسن) تھی۔ 'اُف یہ کہانی' بھی اچھی تھی۔ ہوں..... خطرے۔ ہمیں آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے ہمارے خط میں سے بہت اہم بات حذف کر دی۔ چلیے خیر، ہماری طرف سے مسکین ردی کی ٹوکری کو ہمارے خط کے چھوٹے سے ٹکڑے کا صدقہ۔ لیکن نہیں بھلا ردی کی ٹوکری مسکین کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے تو روز کئی تحریریں پیٹ بھرنے کے لیے ملتی ہیں۔ تو بس پھر ہمارا صدقہ تو ضائع ہی ہوا۔ ارے ہاں جی! یہاں پر ایک بات پوچھنی ہے کہ ہماری کہانی 'میری جاسوسی' اور 'ہم نے چلائی سائیکل' تقریباً تقریباً ایک سال بعد شائع ہوئیں، اتنی تاخیر کی کیا وجہ ہے، وضاحت ضرور کیجیے گا۔

..... ساتھی میں آنے والی تحریروں کی تعداد دیگر پرچوں میں ہوتی ہے۔ اس لیے بعض اوقات کہانی شائع ہونے میں وقت لگ جاتا ہے۔

حافظ محمد ارقم لکھتے ہیں

ساتھی کا پہلا شمارہ خریدا تھا اپنی زندگی میں۔ خوبصورت سرورق، دلچسپ کہانیاں ہر کہانی کا اپنا ہی انداز تھا۔ کیا ایک لفافے میں ایک ہی چیز بھیج سکتے ہیں یا زیادہ چیزیں؟ ذہن لڑائیے انعام پائیے سمجھ میں نہیں آیا۔ پچھلے شمارے کس طرح لے سکتے ہیں؟

..... لفافے کے حساب سے جتنی چیزیں آ سکتی ہیں، آپ بھیج سکتے ہیں۔ پرانے شماروں کے لیے 0336-2246181 پر رابطہ کیجیے۔

ثمین جاوید بسام ساتھی کی مستقل قاریہ بنتی جا رہی ہیں

جولائی کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ پہلے نمبر پر سب سے پہلی کہانی یعنی 'منافع اسکیم' لگی۔ باقی تمام کہانیاں بہت زبردست تھیں۔ 'پینگلز کا راز' کی آخری قسط بھی اچھی لگی۔ آپ کی تخلیق کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ نظموں اور لطیفوں کی تو بات ہی الگ تھی۔ آگے بڑھے تو خطرے میں اپنا اور اپنے بھائی کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

عریشہ نوید حسنات سرورق کا پوسٹ مارٹم کر رہی ہیں.....

سرورق کافی دلچسپ تھا۔ مگر بھئی مچھلیاں بھی کبھی پانی کے اوپر زندہ رہیں اور اتنا کم پانی ہے کہ لڑکے کا پاؤں با آسانی ٹک گیا اور اتنے کم پانی میں اتنی بڑی مچھلیاں حیرت انگیز۔ 'دل پہ دستک' میں خیال اچھا لگا۔ 'منافع اسکیم' میں شروع تو بے حد جاندار، مگر اختتام پرانا انداز۔ 'میں ہوں ہرنوٹا' شمارے کی سب سے اچھی تحریر تھی۔ شروع میں تو کہانی کے اوپر جانور بنے دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ 'جنگل کہانی' ہے اسی لیے نہیں پڑھی لیکن جب بور ہوئے تو اسے بھی پڑھ ڈالی۔ آخر کے مکالمے کافی اچھے تھے اور نصیحت آمیز بھی۔ 'ذہن لڑاؤ، انعام پاؤ' کافی مشکل دینے لگے ہیں۔ رحم کریں ہم بچوں پر۔ 'پینٹنگز کا راز' بہت اچھے انداز میں اختتام پذیر ہوئی۔ 'سرکل' لاجواب تحریر تھی۔ 'میں چھوڑوں نہیں ہوں' اور 'چھوٹا روزہ' چھوٹے بچوں کی کہانی تھی۔ اس لیے اپنی چھوٹی بہن کو بھی سنائی۔ 'گلاب کی کہانی' کچھ خاص متاثر نہ کر سکی۔ 'آپ کی تخلیق' میں بے چارے مرغے میاں سو فیصد ہم پر پوری اُترتی ہے۔ لیکن کہانی میں 'ابا جان' کو مرغا بہت پسند تھا لیکن ہمارے گھر میں بھائی جان کو۔ ہم نے بھی جان چھڑالی۔ مرغے میاں سے۔ لیکن اس طرح نہیں۔ یہ تو قتل ہے ہائے بیچارہ۔ 'وہ ایک حادثہ' کہانی بہت اچھے انداز میں تخلیق کی گئی تھی۔ 'نظر نہ آنے والا پیغام' نے ہمارے تمام خیالات کو ختم کر دیا جو ہم اکثر کارٹون دیکھتے ہوئے سوچتے تھے کہ سارے کاغذ پر تحریر کیسی لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن کر کے دیکھا نہیں ہم نے۔ ٹھہریں ابھی کر کے آتی ہوں۔ جی میں آ گئی۔ ارے ارے نہیں خواب میں نہیں بلکہ سچی میں ..... یقین نہیں آتا تو..... ارے پھر میں کیا کر سکتی ہوں، نہ کریں یقین۔ 'میں کچھ بھی کہہ نہ پایا' نظم بہت بہت اچھی نہیں لاجواب تھی۔ اچھا اب پھر..... نہیں نہیں رکیں آخری بات۔ ذرا کھلکھلایئے اچھے نہیں لگے۔ لیکن آخری صفحے پر قاتل سیاہی پڑھ کر ہنسی آئی اور ہاں بہت بہت مہربانی میری تجویز پر غور و فکر کے بعد عمل کرنے کا۔

محمد بن عبدالرشید ایک شکایت لے کر آئے ہیں۔

آج موسم کچھ سہانا سا تھا۔ تیز تیز ہوائیں چل رہی تھیں اور ہوا سے ایک خوشبو سی مہک رہی تھی جو کہ ساتھی کی آمد کا اشارہ دے رہی تھی۔ اچانک بجلی کڑکی اور ساتھی ہمارے ہاتھوں میں خود بخود آ گیا۔ اشتہاروں کی دنیا سے ہوتے ہوئے جب ہم آگے بڑھے۔ جہاں دل پہ دستک ہمارا کب سے انتظار کر رہا تھا۔ دل پہ دستک کو ذہن نشین کرتے ہوئے ہم آگے بڑھے۔ 'پینٹنگز کا راز' کی دوسری اور آخری قسط بھی خوب رہی۔ کہانیوں میں منافع اسکیم، میں ہوں ہرنوٹا، سرکل، پناہ اور عانیر کی گن پہلے نمبر پر رہیں جبکہ میں چھوڑوں نہیں ہوں، گلاب کی کہانی، چھوٹا روزہ، اُف یہ کہانی اور آئیڈیا نمبر ۱ دوسرے نمبر پر رہی۔ شعر بھری بھی اچھی تھی۔ نظمیں تمام تعریف کے قابل ہے۔ اردو زبان ہماری تو رسالے کی جان ہے۔ ذرا کھلکھلایئے نے خوب کھلکھلایا۔ حیوانی حقیقتیں نظر نہ آنے والا پیغام، ڈیڑھ سو کتابوں کا مصنف، عظیم بھائی کی عظیم بہن، بجلی کیسے بنتی ہے، یورپ کی قدیم ترین مسجد نے معلومات میں مزید اضافہ کیا۔ خطرے میں احزم جاوید بسام کے خط کا جواب پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ آپ کی تخلیق بھی زبردست رہا۔ اب چلے آپ کی کلاس کا وقت ہو گیا ہے۔ ذرا کھلکھلایئے میں آپ نے میرے نام کی جگہ محمد عمیر لکھ دیا ہے اور خطرے میں آپ نے لکھا ہے محمد عمر اور عبدالرشید ہماری محفل میں چلے آئے ہیں جبکہ عبدالرشید میرے والد کا نام ہے، جی ہاں..... آپ نے صحیح پڑھا عبدالرشد میرے والد کا نام ہے۔ اپنے خط کے ساتھ اتنا تشدد دیکھ کر آنکھیں نم ہو گئیں اور پھر ہم نے ان تین سانحات کی وجہ سے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی۔

☆..... آپ نے اپنے اور اللہ کے نام کے درمیان ، دیا تھا جس کی وجہ سے ہم اس خط کو دو افراد کا کارنامہ سمجھ بیٹھے..... اب مسئلہ سمجھ آیا۔

محمد ذیشان خان لکھتے ہیں

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ دراصل بیماری کی وجہ سے ہم اتنے ماہ غیر حاضر رہے۔ الحمدللہ آپ کی دعاؤں سے اب ٹھیک ہیں تو خط لکھ رہے ہیں۔ ساتھی والے بلا ناغہ ہر ماہ 'ہمارا کیا قصور' کا صفحہ شائع کرتے رہے جبکہ ہم ہر ماہ باقاعدگی سے ساتھی شمارے پڑھتے رہے۔ ساتھی والوں سے ایک بات اور کہنی ہے کہ وہ ساتھی میں سے اضافی چیزیں اور اضافی اشتہارات وغیرہ ختم کر کے کہانیوں کو بڑھائیں۔ ماہ جولائی کا

دلفریب شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ خوب صورت سرورق کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب تر رہے۔ کہانیوں اور نظموں کا جواب نہیں۔ اس دفعہ کے لطیفے بھی خوب رہے۔

☆..... آپ کے خیال میں وہ اضافی چیزیں کیا ہیں؟

حذیفہ احمد فرمائش پیش کرتے ہوئے

جولائی کا سرورق لاجواب تھا۔ اشتہارات کی دنیا سے ہوتے ہوئے 'دل پہ دستک' پر پہنچے۔ والد کا نام تو معلوم۔ مگر والدہ کا نام نامعلوم۔ السلام علیکم کے بعد کہانیوں کی دنیا میں داخل ہوئے۔ 'منافع اسکیم' اور 'پناہ' پہلے نمبر پر۔ 'میں ہوں ہرنوٹا' اور 'پینٹنگز کا راز' دوسرے نمبر پر جبکہ 'آئیڈیا نمبر ۱'، 'سرکل'، اور 'اُف یہ کہانیاں' تیسرے نمبر پر ہمارے مطابق براجمان ہوئیں۔ 'ذرا کھلکھلایئے' میں کچھ لطائف پڑھے اور کچھ ان پڑھے معلوم ہوئے۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ 'گلاب کی کہانی' بھی اچھی تھی۔ مگر یہ پرستان' تو نہ ہم گئے ہیں اور نہ ہمارے فرشتے یا کوئی بھی نہیں گیا ہوگا۔ بس احمد عدنان طارق صاحب گئے ہوں گے خواب میں۔ تبھی تو اتنی اچھی کہانی تخلیق کر ڈالی۔ آپ کی تخلیق میں بے چارے مرغے میاں اور 'وہ ایک حادثہ' لاجواب تحریریں تھیں۔ نظموں میں 'میں کچھ بھی نہ کہہ پایا' ٹاپ پر تھی۔ 'ذرا کھلکھلایئے' کا انعامی سلسلہ دوبارہ 'خطرے یا' بہترین کہانی' پر موڑ دیا جائے۔

عائشہ ناصر مختصر مگر پراثر خط کے ساتھ موجود ہیں

جولائی کے شمارے نے اپنی نازک بدنی اور ہماری دلچسپی کے باعث کم ہی وقت لیا۔ جس روز خریدا اسی روز پڑھ لیا۔ خیالی منظر سے سجے کارٹون نما سرورق کو اُلٹا تو حقیقت کو نمایاں کرتی دلکش کہانیوں کو منتظر پایا۔ 'منافع اسکیم' اور 'آئیڈیا نمبر ۱' ایسے بچوں کے متعلق تھیں جو آج کل نایاب ہیں۔ 'میں ہوں ہرنوٹا' کے نام سے ایک ہرن کے بچہ کی کہانی انسانوں کے بچوں کے لیے سبق آموز تھی۔ 'پینٹنگز کا راز' کے بارے میں ذاتی خیال تھا کہ طوالت اختیار کرے گی لیکن دوسری ہی قسط میں راز کھول کر کہانی نمٹا دی گئی۔ 'میں چھوڑوں نہیں ہوں' کا پچہ زیادہ قسم کا باتونی تھا لیکن ہم بچوں کو کیا کہیں آج کل تو بڑے بھی باتوں میں ہیرو اور کام میں زیرو ہیں۔ 'گلاب کی کہانی' پر ہم ضرور اظہار خیال کرتے اگر زندگی میں کبھی بونوں سے ملاقات کی ہوتی۔ فی الحال تو ہم بونوں کو تصوراتی دنیا کی مخلوق ہی سمجھتے ہیں۔ 'عانیر کی ایئر گن' پڑھ کر ایک بات کا شدت سے احساس ہوا کہ عانیر کے ابو کا اسے چھپکلیاں مارنے سے روکنا غلط تھا۔ حدیث رسولؐ میں چھپکلیاں مارنے کا حکم ہے اور حدیث رسولؐ پر عمل کرنے سے توازن فطرت کبھی نہیں بگڑ سکتا۔ اسلامی تاریخ کے مشہور واقعہ سے ملتی جلتی کہانی 'پناہ' عہد نبھانے کا درس دے رہی تھی۔ آپ کی تخلیق کی سب سے منفرد 'جدید آدمی' تھی۔ ہمارے خیال میں اس کا عنوان 'کیسے کیسے آدمی' ہونا زیادہ بہتر تھا۔ چونکہ یہ تبصرہ ماہنامہ ساتھی کی ایک مخلص ساتھی کا ہے اس لیے اسے ساتھی میں جگہ دینا ساتھی ہی کے لیے فائدہ مند ہے۔

☆..... حدیث میں وزغ کا لفظ آیا ہے جس کے معنیٰ گرگٹ کے ہیں نا کہ چھپکلی کے اور گرگٹ کو مارنے کا حکم بعض روایات سے پتا چلتا ہے کہ نبیؐ نے پھر، سانپ کی طرح اسے بھی مارنے کا حکم دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف ایک اور روایت بھی موجود ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''نبیؐ نے وزغ کو فویسق (موذی) فرمایا مگر میں نے نہیں سنا کہ آپؐ نے اسے مار ڈالنے کا بھی حکم دیا ہو۔

مظفر آباد آزاد کشمیر سے رابعہ حسن کو اپنی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں

اُمید ہے مزاج بخیریت ہوں گے۔ ایک عدد کہانی ارسال خدمت ہے۔ اُمید واثق ہے کہ جلد آپ کے رسالے کی زینت بنے گی۔ کہانی عام کہانیوں سے ذرا ہٹ کر ہے۔ ایک بچی کی اچھی فطرت اور اس کی ایک بے سہارا بزرگ خاتون سے محبت کے بارے میں۔ ماہنامہ ساتھی میں یہ میری پہلی کہانی ہے۔ امید ہے ساتھی مجھے خوش آمدید کہے گا اور اس کی حوصلہ افزائی میرے اس سے رشتے میں پختگی پیدا کرے گی۔

ماہ جولائی کے ماہنامہ ساتھی ندیم اختر کا بھرپور تبصرہ پڑھیے اور سر دھنیے.....

گزشتہ کئی ماہ سے ساتھی پر تبصرے کا ارادہ تھا لیکن اطہر ہاشمی کے تبصرے کے سامنے سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف لگتا ہے لیکن آخر کب تک؟ سو اطہر ہاشمی صاحب جو زبان و بیان کی غلطی نکال لیں ہم تبصرہ نگاری میں کود ہی پڑے۔ سوچا بچت اسی میں ہے کہ زبان و بیان کو نہیں چھیڑیں گے بلکہ بس تبصرہ ہی کریں گے۔ ماہ جولائی ۲۰۱۵ء کا شمارہ ہمیشہ کی طرح لاجواب اس لیے کہوں گا کہ اس شمارے میں بھی ہر عمر کے بچوں کے لیے خوبصورت اور معیاری تحریریں شامل ہیں (ہماری کہانی آئیڈیا نمبر ۷ سمیت)۔ مجھے یاد ہے کسی رسالے پر تبصرہ کیے کوئی بارہ سال کا عرصہ تو بیت چکا ہوگا کہ آج پھر طبع آزمائی کرنے چلے ہیں۔ سرورق جاندار اس لیے کہوں گا ایک تو وہ رنگین اور ایسے رنگوں سے مزین ہے کہ ہر دیکھنے والے کی آنکھوں کو بھا جائے۔ اوپر سے بھلا پانی میں بھاگتی مچھلیاں کسی پیاری نہیں لگتی، ایک خوب صورت سی ندی، ندی کنارے سرسبز گھاس نیلگوں آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے، کنارے پر ایک خوبصورت گھر اور کھیل کا میدان اور اس ٹیڑھی ناک والے کو تو دیکھو کیسے سر پر ہیٹ پہنے، پانی کی سیپیوں پر پاؤں جمائے معصوم مچھلیوں کو شکار کرنے کا پکا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔ بس بس ندیم میاں کیا سارا تبصرہ ایک سرورق پر ہی کر دینا چاہتے ہو، ابھی پورے ۱۱۲ اندرونی صفحات بھی ہیں جہاں خوبصورت نظمیں، ہر عمر کے بچوں کے کہانیاں، چٹکلے، رپورتیں، اور کھیل آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چونکہ ہم نے اس ماہ کا شمارہ مکمل پڑھ ڈالا تھا کہ کہیں بغیر پڑھے تبصرہ کر کے پھنس ہی نہ جاؤں۔ اس لیے ان تمام صفحات کا سامنے کرنے کو بالکل تیار ہوں اور مشقیں کس چکا ہوں۔ سب سے پہلے ایڈیٹر بھیا! فصیح اللہ حسینی پڑھنے والوں کے دماغ کی چولیں ہلانے کے لیے اتنا اوکھا قسم کا اداریہ لکھ کر بیٹھے تھے بلکہ اس شمارے میں چھاپ بھی چکے تھے، وہ اداریہ یقیناً جہاں سبق آموز تھا وہاں واقعتاً دماغ کی چولیں ہلانے کے کافی تھا۔ ضیاء اللہ محسن سے اگر اپنے تعلق کی کتھا شروع کروں گا آئندہ ماہ کا پورا شمارہ اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ سوان کی کہانی منافع اسکیم کی جانب آتے ہیں۔ جیسے جیسے کہانی پڑھتا گیا ویسے ویسے تجسس بڑھتا چلا گیا۔ ارے واہ میاں خوب صدقہ خیرات کی اہمیت کو کس خوبصورت انداز میں بچوں تک پہنچایا۔ ایک خوبصورت کہانی جو اپنے مضبوط پلاٹ کی بدولت نمبرون رہی۔ شریف شیدہ منے کی شرارت گنگنا رہے تھے۔ آخر پر کچھ سبق بھی دے دیتے تو نظم ذرا جان دار بن جاتی۔ صفحہ بیس پر کتنی ہی دیر لگ گئی ہاتھی اور ہاتھی کے بچے میں فرق تلاش کرتے کرتے، وہ میری بیٹی عبیرہ جیسے ہی ہابا۔ بابا۔۔ کہتی کمرے میں داخل ہوئی تو میں نے جھٹ سے شمارہ چھپا کر عبیرہ کی جانب ہاتھ بڑھا دیے۔ (آپس کی بات ہے اگر ایسا نہ کرتا تو عبیرہ کے ہاتھ جو رسالہ لگا نہیں اس کے صفحات پھر پورے گھر میں بکھرے ملتے ہیں۔ ابھی چھوٹی ہے نا!) قانعتہ فاطمہ کیا سند باد اتنی ہی خوبصورت جگہ ہے جو وہاں سے آنے کو جی نہیں چاہتا۔ ستمبر میں کراچی آئے تو ضرور دیکھیں گے۔ نظر نہ آنے والا پیغام وہ بھی تصویری ارے واہ بچپن یاد کرا دیا۔ اختر عباس بھیا! میں ہوں..... ہرنوٹا..... یقیناً ایک خوبصورت کہانی۔ میں نے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے یہ ہی کہانی پڑھی۔ اختر عباس کی تحریروں میں ہر بات اہم بات ہوتی ہے۔ لیکن اس کہانی کے آخر پر اہم بات "ایک روز اس نے کہا تم خوش قسمت ہو جو اپنی ماں سے اتنی محبت کرتے ہو، اسے انتیا در کھتے ہو، ورنہ انسانوں نے تو بہت سے رشتے ہی بھلا دیے ہیں" ارے کمال کتنا بڑا سبق دے دیا۔ یقیناً اس تحریر کو پڑھنے والا ہر قاری رشتوں کی قدر کو جان جائے گا اور جو ہم بہت سے رشتوں کے بے قدری پر آج کل تلے ہوئے ہیں۔ اب اپنی میں میں ان رشتوں کو عزیز رشتہ ہی رہنے دیں گے۔ شکریہ اختر عباس بھائی۔ تنویر پھول پاکستان سے باہر بیٹھ کر پاکستان سے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ وہ اُخوت کا نغمہ گنگنا رہے تھے۔ ایک خوبصورت نغمہ تھا۔ ذرا کھلکھلایئے میں لطیفے پڑھ کر تو کم ہنسی آئی البتہ سچ میں جس خوبصورتی سے بم ڈسپوزل والے کو دکھایا گیا اسے دیکھ کر بہت ہنسی آئی۔ ایسا ہی ہو رہا ہے آج کل۔ اب آتے ہیں اس شمارے کی جانداروں کہانیوں میں ایک اور جاندار کہانی کی جانب۔ ارے نہیں یہ تو موصوف ندیم اختر کی کہانی آئیڈیا نمبر 70 ہے۔ رہنے ہی دیں ایسے ہی میاں مٹھو بننے کے چکر میں کہیں احمد عدنان طارق اور اختر عباس بھائی یہ نہ کہہ دیں کہ دیکھو..... منہ اور مسور کی دال..... ظفر شمیم ہمیشہ کی طرح معلومات لیے

کھڑے تھے۔ ماہنامہ ساتھی کی بہت سی خوبیوں میں یہ خوبی نمایاں رہی ہے کہ اس نے بچوں کو معلومات دینے میں کبھی کنجوسی نہیں کی۔ اس بار بھی ایک خوبصورت انداز میں بجلی گھر تک کیسے پہنچتی ہے۔ بچوں کو خوبصورت انداز میں سبق دے رہی تھی۔ احمد حاطب صدیقی ایسی شخصیت ہے جن کی شاعری سے میں متاثر ہوں۔ عنایت علی خان صاحب اور پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی اگر پڑھ لیں کہ ندیم متاثر ہیں تو یقیناً پہلا فقرہ یہ ہی چست کریں گے ندیم اختر بھی متاثرین احمد حاطب صدیقی ہیں۔ میں نے بہت پہلے سب سے پہلی نظم یہ بات سمجھ میں آئی نہیں پڑھی تھی۔ پھر تو جو بھی کلام سامنے آیا بڑے ذوق و شوق سے پڑھا۔ اس شمارے میں ان کی نظم میں کچھ بھی کہہ نہ پایا میں گھوڑے کی داستان سنا رہے تھے اور وہ بھی معلوماتی داستان۔ صفحہ ۴۷ پر ہمارا کیا قصور پڑھے بغیر صفحہ پلٹ دیا تا کہ اس پر عمل نہ کرنا پڑ جائے۔ ذہن لڑاؤ، انعام پاؤ۔ بہت ذہن لڑایا لیکن پلے کچھ نہیں پڑا (ساتھی والوں رحم کرو آج تک کبھی انعام نہیں جیتا اس سلسلے میں..... کوئی اعزازی انعام ہو تو وہ ہی بھیج دیں) ہمیشہ کی طرح اطہر ہاشمی صاحب کا تبصرہ پڑھا۔ دُم دبا کر بھاگے کہ ہماری کہانیوں میں اس طرح غلطیاں نہیں بلکہ غلطان ہوتے ہیں۔ ویسے کوشش کرتے ہیں کہ گرائمر کی رو سے تحریروں کو ٹھیک طرح لکھ پاؤں۔ عالم اسلام کی شاہکار مساجد ایک خوبصورت سلسلہ ہے۔ جیسے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ ساتھی والے معلومات کا خزانہ لیے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ڈیڑھ سو کتابوں کا مصنف بھی ایک معلومات سے بھرپور مضمون ہے۔ ہمارے قائد پیارے قائد اور مادر ملت کی تصویر کے ساتھ عینی نیازی عظیم بھائی کی عظیم بہن کی زندگی کا احوال خوبصورت انداز میں سنا رہی تھیں۔ علی اکمل تصور کی کہانی ہو اور ہم نہ پڑھیں یہ کیسے ممکن ہے۔ سرکل ایک خوبصورت کہانی ہے۔ جس میں حب الوطنی کا درس دیا گیا ہے۔ اگر ہمارے ادارے اس ملک کو اس انداز میں چلانے پر آجائیں تو آج ہم بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔ سلیم فاروقی کی کہانی "میں نہیں چھوڑوں گا" ننھے منے عاطر کی ننھی منی باتیں۔ ایسی باتیں سن کر ہی مزہ آجاتا ہے۔ افق دہلوی صاحب کے چوزے، ایک مرغی کی داستان تھی کہ وہ کیسے اپنے چوزوں کی حفاظت کرتی ہے۔ واقعی ماں اپنے بچوں کو بچانے کے لیے کبھی کبھی اپنے سے بڑے جان والے پر بھی جھپٹ پڑتی ہے۔ اب آتے ہیں انسپکٹر صاحب کی جانب، جی ہم سب کے انسپکٹر احمد عدنان طارق صاحب اس بار گلاب کی کہانی سنا رہے تھے۔ آپ نے بھی سنی اور میں نے تو پہلے ان سے فون پر سنی پھر ساتھی میں پڑھی۔ مجھے احمد عدنان طارق صاحب کی بہت سی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اچھی نہیں لگی۔ بلکہ ایسی بہت سی کہانیاں جو کم اچھی لگی ہیں۔ گلاب کی کہانی بھی انہی کہانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ احمد عدنان طارق بچوں کو بونوں کی دنیا، پریوں کی دنیا میں لے کر جاتا ہے جہاں بچے خوش ہو جاتے ہیں۔ ویسے احمد صاحب بچے خوش ہوئے۔ آپ بھی بچوں کو دیکھ کر خوش ہو جایئے۔ رونسن سیموئیل گل بچوں کے لیے خوبصورت کہانیاں لکھتا ہے۔ عانیر کی ائیر گن بھی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ پلاٹ تھوڑا ماٹھا نکلا لیکن سبق بہت بڑا دے گیا۔ وقار محسن کی کہانی "پناہ" پڑھی۔ اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے وقار محسن صاحب کے لیے دعا بھی کیے دیتے ہیں (وقار محسن صاحب ماہنامہ ساتھی کے معروف لکھاری تھے، تھے میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اب وہ ہم میں نہیں ہیں۔ رمضان شریف کے آخری عشرے میں ان کی وفات ہوگئی اللہ باری تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ یقیناً ہر ذی روح نے فنا ہونا ہے۔ ان کی کہانی پناہ ان بڑے لوگوں کی کہانی ہے جو اپنے قول کو نبھاتے ہیں۔ جو اپنے مہمانوں کی مہمان داری کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اپنے اصولوں پر کسی اور چیز کو حاوی نہیں ہونے دیتے۔ یہ بڑے لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ جیسے وقار محسن ایک بڑے آدمی تھے) ضیاء اللہ محسن اپنی کہانی کے بعد منظوم شکل میں جنگ بدر کا واقع خوبصورت انداز میں سنا رہے ہیں۔ راحت عائشہ نے چھوٹا روزہ کہانی کی صورت میں کتنی ساری دعائیں ہی یاد کرا دیں۔ ایسی کہانیاں بچوں کے لیے بہت مفید کہانیاں گردانی جاتی ہیں کہ کہانی نگار کھیل کھیل میں بچوں کو پڑھا دے۔ سمیرا امیر کی کہانی اُف یہ کہانی پڑھ ایسے ہی لگا اُف یہ کہانی! آئندہ کہانی لکھیے گا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں بھی پڑھیں۔ خطوط بھی پڑھے اور آخری صفحات پر گل نوخیز اختر کا قاتل سپاہی بھی پڑھ لیا۔ یہ تو ایک سو بارہ صفحات ختم ہو گئے۔ لگتا ہے ہمارا تبصرہ بھی اختتام پذیر ہو گیا۔

OO

"کوئی بات نہیں، میں بتاؤں گا اور خوب نعرے لگا لگا کر بتاؤں گا۔" معروف پرجوش لہجے میں بولا۔

"اور اگر جان نکل جائے تو..." ندیم نے آہستہ سے موٹو کے کان میں کہا۔

"تب بھی بتا دینا۔ ہائیں! کیا کہا؟ جان؟" موٹو سٹپٹایا پھر غصے سے کہا: "بکواس بند کرواپنی۔"

"بھئی! کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور ...." میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ موٹو درمیان میں بولا: "تم خاموش رہو۔" اور مجھے امپائر کی ذمہ داری سونپ دی پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"میرے خیال میں وہ کونے والا درخت ٹھیک رہے گا۔ ویسے بھی اس طرف کم ہی کوئی آتا ہے۔ چلو اس طرف۔" جب ہم اُس درخت کے قریب پہنچ گئے تو موٹو نے نبیل سے کہا: "اب تم لیٹ جاؤ۔ جب وہ لیٹ گیا تو ہر ایک نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو پکڑ لیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کچھ دیر جھلانے کے بعد ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے جھٹکا دینا ہے۔"

موٹو تحکمانہ لہجے میں بولا: "جب میں کہوں تب جھٹکا مارنا ہے، ٹھیک ہے، سمجھ گئے سب؟"

"یس باس!!" سب نے بیک وقت فرماں برداری کا اظہار کیا پھر وہ نبیل کو جھلانا شروع ہو گئے..... وہ سب آنکھیں بند کر کے خوب زور زور سے اسے جھلا رہے تھے جب کہ نبیل بوکھلایا ہوا تھا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔ میرا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ رومال نکال کر میں نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔

پھر نجانے کیا ہوا کہ ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے نعرۂ مستانہ لگایا۔ میں نے دیکھا کہ موٹو، ندیم اور شیراز آپس میں تالیاں مارنے لگے اور ایک دوسرے کو گلے لگ کر مبارک باد دینے لگے۔

"ہررا! بن کباب منگواؤ، پیپسی کے ساتھ۔ موٹو فوراً مقصد کی طرف آ گیا۔ کتنی ہی دیر تک یہ اودھم مچتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہنگامہ ذرا کم ہوا تو سب سے پہلے ندیم کی آواز سنائی دی: "ارے! یہ معروف کیوں کراہ رہا ہے؟"

"بے وقوف کراہ نہیں رہا بلکہ خوشی سے پاگل ہوا جا رہا ہے۔" شیراز جھومتے ہوئے بولا۔

ایسے میں معروف کی مردہ سی آواز سنائی دی: "ہائے میرا سر۔"

یہ سن کر وہ اس کے قریب ہوئے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے تو امپائرنگ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے فوری طور پر حالات کا جائزہ لیا اور فیصلہ سنایا: "اسے چھوڑو، نبیل کو دیکھو۔ اُس.... اس کا ہاتھ نکل آیا کم بختو۔"

یہ سننا تھا کہ پل بھر میں ہنگامہ بند ہو گیا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس اچانک افتاد پر سب بوکھلا گئے، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ ہوا کیا ہے، ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ جب کچھ سنبھلے تو دیکھا کہ نبیل ہاتھ اور معروف سر پکڑے بیٹھا ہے۔ ہنگامے میں کسی نے معاملے کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی کہ کیا ہوا ہے؟ اصل میں ہوا یوں کہ اس دھینگا مشتی میں معروف سے نبیل کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ خود تو وہ درخت سے جا ٹکرایا اور سر پر چوٹ کھائی اور دوسری طرف نبیل بے چارے کا آخر نکل گیا..... قد تو نہیں لیکن ایک ہاتھ ضرور اپنی جگہ سے ہٹ کر جوڑ سے نکل گیا اور وہ ہاتھ لے کر بیٹھ گیا..... دوسری طرف چوں کہ معروف کا رخ دوسری طرف تھا اس لیے سب یہی سمجھے کہ وہ مارے خوشی کے ہنس رہا ہے۔

پھر سب سے پہلے موٹو کو ہوش آیا۔ جب اس نے سوجا لٹ کا خطرہ محسوس کیا تو لگا دوڑ لگانے۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی رفو چکر ہو گئے۔ میں نے عافیت اسی میں جانی کہ فوراً اسکول کے دفتر میں اطلاع کر دوں.....

اگلے دن میں نبیل سے ملنے گیا تو اسے ہائے ہائے کرتے پایا۔ ہاتھ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے میری نصیحت پر کان کیوں نہ دھرے۔ پھر اس نے عہد کر لیا کہ وہ قد کو بڑا کرنے کے چکر میں نہیں پڑے گا بلکہ اخلاق کو سنوار کر بڑا بننے کی کوشش کرے گا۔

☆.....☆